عقیدہ و منہج

عقیدہ، منہج کا سمجھنا دین میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے- انبیاء سب سے پہلے آ کر عقیدے کی اصلاح کیا کرتے تھے- عقیدے کی اصلاح کے ساتھ ہی عمل کی اصلاح ہوتی ہے اور عمل کی اصلاح سے اخلاق و معاملات کی اصلاح ہوتی ہے اور اس طرح پورے معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے- اس سارے عمل میں بنیاد عقیدہ ہے- ہر مسلمان کو سب سے پہلے اپنے عقیدے کا فہم و شعور حاصل کرنا چاہتے اور یہ جاننا چاہئے کہ اس کا عیقدہ درست اور عین اسلام کے مطابق ہے یا نہیں کیونکہ نجات کا سارا دارومدار عقیدے پر ہے- اگر عقیدہ درست نہ ہوگا تو اچھے سے اچھا عمل بھی بے کار جائے گا-

لیکچرز: پروفیسر حافظ محمد سعید حفظہ اللہ

سال مئی 99ء میں امیر محترم پروفیسر حافظ محمد سعید نے معسکر اقصیٰ میں جہاد کی تربیت کیلئے آنے والے مجاہد ساتھیوں کے سامنے عقیدہ و منہج پر بڑے تفصیلی دروس دیئے چونکہ حافظ صاحب نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ اس موضوع کو بیان کیا اور ہمارے ہاں عقیدے کی جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں، انہیں بڑے آسان اور مناسب پیرائے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح کیا، اس لئے ان دروس کی اہمیت کے پیش نظر ادارہ نے انہیں تحریری اسلوب میں ڈھال کر پیش کر دیا ہے- امید ہے قارئین اس سے بھرپور استفادہ کریں گے- (ادارہ)

تفصیلات

قسط نمبر۱۔ انسان کو کیوں پیدا کیا گیا؟

مخلوق کسی حادثے کی پیداوار نہیں نہ خود بخود پیدا ہوئی نہ ارتقاء کے تحت

عبادت کیا ہے؟

کیا رضائے الٰہی کا حصول ہمارا اصل مقصد اور نصب العین ہے یا عبادت اصل مقصد ہے؟

کیا داڑھی میں اسلام نہیں؟

قسط نمبر۲۔ اللہ کی عبادت کیسے کی جائے؟

صوفیاء میں عبادت کے مختلف طریقے:

نماز٬ روزہ اور اقامت دین:

سنت کی نسبت نبی ﷺ کی طرف کیوں؟

قسط نمبر۳ غلبہء دین اور نفاذ شریعت کے طریقے

شریعت کے مطابق حکومت کرنا بھی عبادت ہے

اسلام نافذ کرنے کے لئے الیکشن کے طریقے کی شرعی حیثیت

غلبۂ اسلام کا طریقہ جہاد ہے

لیکن جہاد جیسی عظیم عبادت بھی اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کے مطابق کرنے سے قبول ہوگی

جہاد سے پہلے کافروں کو دعوت دینے کا مسئلہ

تلوار کے ذریعے اسلام پھیلنے کا اصل مطلب

''دین میں جبر نہیں'' کا مطلب

قسط نمبر۴۔ کیا اللہ کی عبادت خوف اور طمع (جہنم کے ڈر اور جنت کے لالچ وغیرہ) کے ساتھ نہ کی جائے؟

اللہ سے کچھ نہ مانگنا اور دعا نہ کرنا تکبر ہے

بعض شبہات کا ازالہ

کیا صرف لا الہ الا اللہ کہنے والا جنت میں داخل ہو جائے گا اور اسے اعمال کی ضرورت نہیں ہوتی؟

کیا حقوق العباد پورے کرنے کافی ہوتے ہیں اور کیا محض انہی حقوق کی ادائیگی سے حقوق اللہ یعنی نماز روزہ وغیرہ معاف ہو جائیں گے

قسط نمبر۵ عبادت میں احسان

ایک مسلمان کے لئے دین کا کم از کم اتنا علم اور عمل ضروری ہے

نماز٬ ورزش اور اٹھک بیٹھک کے لئے نہیں

نماز میں خیالات و وساوس کی وجہ

کیا اللہ کو دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے؟

احسان کی آڑ میں بندے کو رب بنانے والے گمراہ کن فلسفوں کا تذکرہ

قسط نمبر۶ توحید کی اقسام اور اس کے فوائد

رسولوں کی بعثت کا مقصد۔ دعوت کیا ہے؟۔ طاغوت کیا ہے؟۔ دین میں توحید اور دیگر شرعی احکامات کی حیثیت اور تعلق

توحید ربوبیت۔ دو شبہات کا ازالہ۔ اللہ اور بندے کے اختیار میں فرق

عقیدہ و منہج

قسط نمبر ا

لیکچرز: پروفیسر حافظ محمد سعید حفظہ اللہ

سال مئی 99ء میں امیر محترم پروفیسر حافظ محمد سعید نے معسکر اقصیٰ میں جہاد کی تربیت کیلئے آنے والے مجاہد ساتھیوں کے سامنے عقیدہ و منہج پر بڑے تفصیلی دروس دیئے چونکہ حافظ صاحب نے بڑی شرح وبسط کے ساتھ اس موضوع کو بیان کیا اور ہمارے ہاں عقیدے کی جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں' انہیں بڑے آسان اور مناسب پیرائے میں قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح کیا' اس لئے ان دروس کی اہمیت کے پیش نظر ادارہ انہیں تحریری اسلوب میں ڈھال کر پیش کر دیا ہے- اس سلسلے کی پہلی قسط پیش خدمت ہے- امید ہے قارئین اس سے بھر پور استفادہ کریں گے- (ادارہ)

عقیدہ' منہج کا سمجھنا دین میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے- انبیاء سب سے پہلے آ کر عقیدے کی اصلاح کیا کرتے تھے- عقیدے کی اصلاح کے ساتھ ہی عمل کی اصلاح ہوتی ہے اور عمل کی اصلاح سے اخلاق و معاملات کی اصلاح ہوتی ہے اور اس طرح پورے معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے- اس سارے عمل میں بنیاد عقیدہ ہے- ہر مسلمان کو سب سے پہلے اپنے عقیدے کا فہم و شعور حاصل کرنا چاہتے اور یہ جاننا چاہئے کہ اس کا عیقدہ درست اور عین اسلام کے مطابق ہے یا نہیں کیونکہ نجات کا سارا دارومدار عقیدے پر ہے- اگر عقیدہ درست نہ ہوگا تو اچھے سے اچھا عمل بھی بے کار جائے گا-

عقیدے میں سب سے پہلا اور بنیادی سوال یہ ہے کہ

انسان کو کیوں پیدا کیا گیا؟

اس کا جواب اللہ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں ہمیں یہ دیا ہے کہ

وَ مَا خَلَقْتُ الجِنَّ وَالاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُونِ

''جنوں اور انسانوں کو ہم نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں-'' (الذاریات:56)

اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہے- آپ ﷺ نے فرمایا:

حَقُّ اللّٰهِ عَلَى العِبَادِ اَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلاَ يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا

'' اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں- کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں-'' (حوالہ؟)

ہر مذہب اور فلسفے میں یہ سب سے بڑا سوال ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے- اسی پر پھر پورے مذہب اور نظام و فلسفے کا انحصار اور دارومدار ہوتا ہے-

مخلوق کسی حادثے کی پیداوار نہیں نہ خود بخود پیدا ہوئی نہ ارتقاء کے تحت

اسلام نے اس بنیادی سوال کا جواب ہمیں یہ دیا ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے- ہم کسی حادثے کی پیداوار نہیں نہ ہی یہ کائنات کسی حادثے کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی ہے اور نہ یہ خود بخود پیدا ہوئی ہے بلکہ اس کو پیدا کرنے والا اللہ ہے- اور پھر اس کائنات کی تخلیق ارتقاء کے تحت بھی نہیں ہوئی بلکہ جس طریقے سے اللہ نے چاہا' اس کو اس طریقے سے پیدا کیا- اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں چار قسمیں کھا کر فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الاِنْسَانَ فِي اَحْسَنِ تَقْوِيْم ''ہم نے انسان کو سب سے بہتر شکل میں پیدا کیا-'' (العلق:4)

یعنی ایسا نہیں ہے کہ پہلے وہ بندر تھا' پھر بندر سے انسان بن گیا (جیسا کہ بعض مغربی مفکرین ڈارون وغیرہ انسان کی تخلیق کو فلسفۂ ارتقاء کے تحت بیان کرتے ہیں) اور اب انسان سے پتہ نہیں کچھ اور بن جائے گا- ظاہر ہے اگر ارتقائی فلسفہ (Theorry of evolution) کے مطابق

یہ سلسلہ جاری ہے تو سارے انسان کچھ اور بھی بننا چاہیں گے۔

یہ بھی ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ جیسے فلسفے اور نظریات ہوں گے' انسان پر بھی اس کے ویسے ہی اثرات ہوں گے۔ جو لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے یا نہیں مانتے کہ اللہ نے ہمیں پیدا کیا یا اللہ نے ہمیں اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے اور وہ صرف یہی سمجھتے ہیں کہ کائنات ایک حادثے یا ارتقاء کے تحت وجود میں آئی ہے' نباتات سے کیڑے مکوڑے اور کیڑے مکوڑوں سے ہڈی والے جانور اور پھر ان سے بندر اور بندروں سے بڑھتے بڑھتے لاکھوں سال کے ارتقاء کے بعد انسان معرض وجود میں آگیا۔ ایسے گمراہ اور خود ساختہ فلسفوں کے ماننے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان جانوروں کی طرح بننے کی کوشش کرتا ہے۔ جنس سے لے کر رہنے سہنے' بود و باش اور اخلاقیات کے تمام معیار اور خصوصیات جانوروں جیسی اختیار کرنے لگتا ہے۔ اپنی اعلیٰ اخلاقی اقدار کھو بیٹھتا ہے۔ یہ ارتقاء کے نکتہ نظر کو ماننے کے اثرات ہیں۔

دوسری طرف جب یہ بات انسان مان لے کہ اللہ نے پیدا کیا اور اس نے اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور جو کچھ بھی ہم کر رہے ہیں اس کا ہم نے اللہ تعالیٰ کے حضور ایک دن جواب دینا ہے مرنے کے بعد آخرت میں ہمارے ایک ایک عمل کا حساب ہوگا' اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ میں نے تمہیں جس مقصد کے لئے پیدا کیا تھا' بتاؤ وہ مقصد پورا کر کے آئے ہو یا نہیں آئے' جب دل و دماغ میں یہ نکتہ نظر اور مقصد جاگزیں ہو جاتا ہے تو پھر زندگی کا رخ یکسر بدل جاتا ہے۔

لیکن جب یہ نکتہ نظر نہ ہو تو پھر جانوروں کی سی زندگی ہے بلکہ فرمایا: بل ھم اضل "جانوروں سے بھی بدتر زندگی ہوتی ہے۔"

یہ سمجھ لینے کے بعد کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور اس نے اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا ہے' تو اب سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبادت کیا ہے؟

اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ:

"عبادت ان تمام اقوال اور افعال کا نام ہے جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں۔ جیسے دعا' نماز' قربانی وغیرہ"

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ

عبادت کیا ہے؟

"انسان کے وہ تمام اقوال و افعال جن سے اللہ راضی ہو جائے' عبادت کہلاتے ہیں۔"

یعنی ایک دو یا چند چیزیں عبادت نہیں ہیں بلکہ انسان کے تمام اقوال و افعال کو جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہو' عبادت کہتے ہیں۔ وہ فعل انسان کی آنکھ کا بھی ہو سکتا ہے' انسان کے کان کا فعل بھی ہو سکتا ہے یا اس کے ہاتھ کا بھی۔ غرض انسان سے ایسے جتنے افعال سرزد ہوں جن سے اللہ راضی ہو' وہ عبادت میں داخل ہیں۔ اسی طرح انسان کے وہ تمام اقوال بھی جن سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہو' عبادت میں شامل ہیں اور ان میں صرف یہ نہیں کہ کوئی کہہ دے بس قرآن مجید کا پڑھنا عبادت ہے یا اللہ کا ذکر کر لینا ہی عبادت ہے بلکہ اللہ کی رضا حاصل کرنے والے تمام اقوال عبادت ہیں۔ کوئی اپنے بھائی کو اچھی نصیحت کرتا ہے تو یہ بھی عبادت ہے کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ کوئی کسی کو صحیح راستہ بتا دیتا ہے' اس کی درست رہنمائی کرتا ہے تو یہ بھی عبادت ہے۔ غرض صرف نماز پڑھ لینا' روزہ رکھ لینا یا وہ چند چیزیں ہی عبادت نہیں جنہیں عام طور پر عبادت سمجھا جاتا ہے بلکہ عبادت بہت ہی جامع چیز ہے۔

عبادت کی جامع ترین تعریف یہ کی گئی ہے کہ:

العِبَادَةُ اِسْمٌ جَامِعٌ لِمَا یُحِبُّهُ اللّٰهُ وَ یَرْضٰی

" عبادت ایسی جامع چیز ہے جس سے اللہ راضی ہو جائے۔"

جس چیز سے اللہ تعالیٰ خوش ہو جائے مِنْ قَوْلٍ اَوْ فِعْلٍ
یعنی قول اور فعل سے' وہ عبادت ہے۔

امام ابن تیمیہؒ نے اپنی عقیدے کی کتاب میں اس کی تعریف یوں بیان فرمائی ہے کہ:

'' انسان کمال عاجزی کے ساتھ اللہ کی کمال محبت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے تو یہ عبادت ہے۔''

کمال عاجزی کا مطلب ہے' انسان پوری عاجزی کے ساتھ اللہ کے سامنے جھک جائے۔ ویسے تو انسان اللہ کے سوا بھی جس سے ڈرتا ہے' اس کے آگے جھک جاتا ہے لیکن اللہ کے سامنے جھکنے میں صرف ڈرنا یا عاجزی ہی مراد نہیں بلکہ انسان اللہ کے سامنے اپنی تمام قربتوں' تمام چاہتوں اور تمام محبتوں کے ساتھ جھکے تو یہ عبادت ہے۔ اس میں عاجزی اور محبت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ یہ ہے عبادت جس میں انسان کے تمام ذاتی افعال بھی شامل ہوتے ہیں اور اجتماعی افعال بھی اور ایسی تمام چیزیں جو اللہ کے ہاں مطلوب ہیں۔

اجتماعی افعال میں سیاست کو ہی لے لیں۔ اگر انسان اسلام کے مطابق سیاست کرے جس سے اللہ خوش ہو تو یہ بھی عبادت ہے۔ یہ اسلامی سیاست ہے جس کا اللہ حکم دیتا ہے۔ اسی طرح معیشت اور تجارت کے وہ تمام طریقے جن کے ذریعے انسان کاروبار کرتا ہے' اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہے' اگر یہ طریقے اللہ کے حکم کے مطابق ہوں تو اس کی یہ ساری معاشی کوششیں بھی عبادت میں داخل ہوں گی۔ گویا اگر ہم اللہ کی رضا کے مطابق تمام کام کریں تو ہمارا سونا جاگنا بھی عبادت' ہمارا کھانا پینا بھی عبادت' اٹھنا بیٹھنا بھی عبادت' ہماری سیاست بھی عبادت اور ہماری تجارت بھی اللہ کی عبادت ہو گی۔ یہی انسان کی تخلیق کا مقصد ہے۔ اگر انسان اللہ کی رضا کے مطابق اپنے سارے کام کرتا ہے تو اس سے انسان کی تخلیق کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ اور اگر وہ اس کے برعکس کام کرتا ہے تو گویا وہ اپنی تخلیق کے مقصد سے ہٹ کر غلط کام کر رہا ہے۔ اللہ نے اسے ایسے کاموں کے لئے دنیا میں بھیجا ہی نہیں اور نہ اسے ایسے کام کرنے کی اجازت ہے جن سے اللہ تعالیٰ خوش نہ ہو۔ اور جن کاموں سے وہ خوش اور راضی ہو' وہ سب عبادت ہیں۔ ان میں دعا بھی ہے' نماز بھی ہے' روزہ بھی ہے' قربانی بھی ہے۔ عبادت کی اس جامع تعریف میں اللہ کو راضی کرنے والی ہر چیز شامل ہے۔ جیسے اللہ نے قرآن مجید میں فرمایا:

قُلْ اِنَّ صَلاتِی وَ نُسُکِی وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِیْنَ

'' کہہ دیجئے بے شک میری نماز' میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔'' (الانعام:162)

کیا رضائے الٰہی کا حصول ہمارا اصل مقصد اور نصب العین ہے یا عبادت اصل مقصد ہے؟

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہماری تخلیق کا نصب العین یا مقصد اللہ کی عبادت ہے۔ اور عبادت کے ذریعے ہم نے رضائے الٰہی کا حصول کرنا ہے۔ گویا رضائے الٰہی کا حصول نتیجہ ہے عبادت کا۔ اللہ نے انسان کے لئے جو عبادت کے طریقے مقرر کر دیئے ہیں' انہی کے ذریعے انسان اللہ کی رضا حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے سوا کسی اور چیز سے رضائے الٰہی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ بعض لوگ یہ سمجھ کر کہ رضائے الٰہی کا حصول اصل مقصد ہے تو پھر وہ عبادت کو اس کے تابع کر دیتے ہیں۔ عبادت کو اصل مقصد نہیں سمجھتے چنانچہ وہ عبادت یا عبادت کے طریقوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ عبادت چاہے جیسے مرضی کر لیں' اصل مقصود تو رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اس لئے وہ عبادت کے طریقے اپنی مرضی سے بنا لیتے ہیں۔ کسی نے کہہ دیا اللہ تعالیٰ اس طریقے سے خوش ہو جائے گا۔ کسی نے کہا' اس طریقے سے خوش ہو گا۔ یہی وہ مقام ہے سمجھنے کا کہ لوگوں نے عبادت کے الگ الگ طریقے کیوں بنا لئے؟ صرف اسی وجہ سے کہ انہوں نے عبادت کو اپنی زندگی کا نصب العین یا اصل مقصد قرار نہیں دیا۔ اصل مقصد رضائے الٰہی کا حصول قرار دے دیا اور عبادت کو اس کا ذریعہ بنا لیا۔ حالانکہ عبادت اصل مقصود ہے اور رضائے الٰہی اس کا نتیجہ ہے۔

حقیقت بات یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے عبادت کو اصل مقصود قرار دیا ہی نہیں- بڑی بڑی ضخیم کتابیں اور جماعتوں کے دستور ومنشور ایسے موجود ہیں جن میں سب سے پہلا جملہ ہی یہی لکھا ہوتا ہے کہ ہمارا مقصود یا ہمارا نصب العین رضائے الٰہی کا حصول ہے- اور پھر اس کے ساتھ بہت ساری باتیں انہوں نے اپنی طرف سے لکھی ہوتی ہیں- ان باتوں کے اثرات آگے چل کر منہج پر، عمل پر اور اجتماعی اور جماعتی زندگی پر بہت گہرے ہوتے جاتے ہیں- اور اگر منہج خراب ہو جائے تو اس کے بعد منزلیں کھو جاتی ہیں-

کیا داڑھی میں اسلام نہیں؟

ہمارے ہاں جب کسی کو کہا جاتا ہے کہ بھائی داڑھی رکھ لیں تو وہ عام طور پر یہ جواب دیتا ہے کہ بھائی داڑھی میں تو اسلام نہیں ہے- اسلام میں داڑھی ہے- یعنی اسلام میں بے شک داڑھی ہے، رکھنی چاہئے لیکن یہ سمجھ لینا کہ اب اس کے بغیر گزارہ نہیں تو ایسی پریشانی والی کوئی بات نہیں- اسلام کوئی صرف داڑھی میں تو نہیں ہے- اسی طرح کسی کو نماز کے بارے میں کہا جائے تو وہ بھی یہی کہہ سکتا ہے کہ نماز نہ بھی پڑھیں تو کونسی بات ہے- اسلام صرف نماز میں تو نہیں ہے- کسی راشی کو کہا جائے کہ بھائی رشوت نہ لو تو وہ بھی یہی کہہ سکتا ہے کہ اسلام صرف رشوت نہ لینے میں تو نہیں ہے- اسی طرح چور، ڈاکو، زانی، قاتل غرض جو جو جس برائی میں مبتلا ہو، یہی جواب دے کر جان چھڑا سکتا ہے- کہ اسلام صرف اسی ایک برائی کے چھوڑ دینے میں تو نہیں ہے- اور یہ حقیقت ہے، یہ کوئی فرضی بات نہیں، آجکل معاشرے میں عام طور پر ہر کوئی اپنی برائی کے بارے میں یہی خیال اور جواز رکھتا ہے اور کہتا بھی ہے- یا تو اپنے بڑے افسروں پر بات ٹال دی جاتی ہے کہ پہلے ان کا حساب تو کریں، وہ ہم سے زیادہ کرپشن کر رہے ہیں- ان کی طرف تو کوئی دیکھتا نہیں- اسی طرح بڑا افسر اپنے سے اور بڑے افسر پر ڈال دیتا ہے- بالآخر وہ اسے برائی سمجھنا ہی چھوڑ دیتے ہیں اور اگر کوئی انہیں سمجھائے تو کہتے ہیں کیا اسلام سارا اسی برئی کے چھوڑنے میں ہے- کسی کو نماز کے بارے میں کہیں تو وہ بھی یہی کہہ لیتا ہے، کیا اسلام صرف نماز میں ہے- یہ سب باتیں عقیدے کی بہت بڑی بنیادی خرابی پر دلالت کرتی ہیں- گویا کہ ہم نے عبادت کے مفہوم کو سمجھا ہی نہیں- عبادت کو مقصود بنایا ہی نہیں- حالانکہ جن کاموں کا بھی اللہ نے حکم دیا ہے، داڑھی رکھنا ہے یا نماز پڑھنا ہے وغیرہ تو یہ سب کام اللہ کی عبادت ہیں:

نبی ﷺ نے فرمایا:

قال اللّٰه و تعالیٰ و ما تقرب الیھا عبدی بشیء احب الیھا

’’اور نہیں تقرب حاصل کرتا میری طرف میرا بندہ مگر اس چیز کے ساتھ جو مجھے بہت زیادہ محبوب ہے ان چیزوں سے جو میں نے اس پر فرض قرار دی ہے-‘‘

سادہ لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرا بندہ اس چیز سے میرا تقرب حاصل کر سکتا ہے جو مجھے زیادہ محبوب ہو اور میں نے اس پر فرض قرار دے دی ہو-

یہ حدیث قدسی ہے (یاد رہے کہ عام حدیث تو اسے کہتے ہیں جس میں راوی نبی ﷺ سے کوئی روایت کرتا ہے- جبکہ حدیث قدسی وہ ہوتی ہے جس میں راوی نبی ﷺ سے بیان کرتا ہے اور نبی ﷺ اللہ سے روایت کرتے ہیں- یعنی نبی ﷺ خود بھی راوی بن جاتے ہیں- کہا جا سکتا ہے کہ قرآن بھی نبی ﷺ نے اللہ سے روایت کیا ہے تو اس میں اور حدیث قدسی میں کیا فرق ہے تو یہ جاننا چاہئے کہ قرآن بھی بے شک نبی ﷺ نے اللہ سے ہی لیا ہے لیکن یہ اللہ کے اپنے الفاظ اور کلام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جبکہ حدیث قدسی اللہ کا کلام نہیں ہوتا، اللہ کے کلام کا مفہوم ہوتا ہے- الفاظ نبی ﷺ کے اپنے ہوتے ہیں- اسی طرح عام حدیثوں میں ہمیں جب الفاظ کا کچھ اختلاف نظر آتا ہے تو بعض منکر حدیث ٹائپ لوگ یہ وہم ڈالتے ہیں کہ نبی ﷺ کے الفاظ مختلف کیسے ہو سکتے ہیں، اس لئے وہ حدیثوں کو مشکوک قرار دے دیتے ہیں حالانکہ حدیثیں بھی نبی ﷺ کے الفاظ کا مفہوم ہوتی

ہیں-انہیں یہ غور کرنا چاہئے کہ الفاظ بے شک مختلف ہوں لیکن مفہوم تو ایک ہی ہے-احادیث کے لئے سند کا مستند ہونا ضروری ہے' الفاظ کا ایک ہونا ضروری نہیں-اگر مفہوم ایک ہو تو صحابہ ؓ نبی ﷺ کی بات کو مختلف الفاظ سے پہنچا سکتے ہیں وراس کے لئے سب حدیثوں میں ایک جیسے الفاظ کی پابندی لازمی نہیں-زیادہ تر دعاؤں والی احادیث میں اس کا امتزام کیا گیا ہے کہ نبیؐ کے اصل الفاظ ہی کو بیان کیا جائے-دیگر احادیث میں عموماً یہ اہتمام نہ کیا گیا ہے نہ ضروری ہے)

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عبادت وہ تمام چیزیں ہیں جو اللہ کو محبوب ہیں- اللہ تعالیٰ کو انسان کے لئے جو محبوب چیزیں تھی' وہ اللہ نے عبادت بنا کر اپنے بندے پر فرض قرار دیں اور انہیں بندے پر لازم کر کے بیان کر دیا- اور بتا دیا کہ اب انہی کے ساتھ عبادت ہوگی- ان چیزوں کا تعلق صرف نماز روزہ جیسے چند احکام تک محدود نہیں بلکہ اس میں انسان کی انفرادی زندگی سے اجتماعی زندگی تک' اخلاق ومعاملات سے لے کر نکاح' طلاق' سیاست' تجارت غرض سب کچھ اس میں شامل ہے' اوران میں چاہے چھوٹی چیزیں ہوں یا بڑی' جن جن کا اللہ نے حکم دیا ہے' ان سب کا بجالانا ضروری ہے-اس لئے کہ یہ عبادت ہیں اور ہمارے اوپر فرض ہیں اور انہی سے اللہ کا تقرب حاصل ہوسکتا ہے-

اگر کوئی شخص داڑھی نہ رکھنے کو اپنی کوتاہی اور غلطی کہے اور اس کا ایمان ہو کہ سے ضرور رکھنی چاہئے اور یہ کہے کہ میں ان شاء اللہ ضرور رکھوں گا تو یہ اور بات ہے لیکن اگر آدمی داڑھی کو غیر ضروری کہے اور یہ کہے کہ داڑھی میں کونسا اسلام ہے تو یہ سراسر عقیدے کی بڑی خرابی ہے- جب ایک چیز اللہ کی طرف سے مقرر کر دی گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کو محبوب ہے اور انہی چیزوں کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل ہوسکتا ہے جو اللہ کو محبوب ہوں اور انہی چیزوں کے ذریعے اللہ کی عبادت ہوسکتی ہے-اس لئے یہ جملہ سراسر گمراہی پر مبنی ہے کہ داڑھی میں اسلام نہیں- اسلام میں ہر اس چیز کی برابر اہمیت ہے جس کا اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے حکم دے دیا اس لئے کہ یہ سب کچھ اللہ کی عبادت میں داخل ہے-

اللہ کی عبادت کیسے کی جائے؟

یہ واضح ہو جانے کے بعد اللہ کی عبادت سے مراد انسان کے وہ تمام اقوال وافعال ہیں جن سے اللہ راضی ہو جائے اور یہ کہ نماز، روزہ اور چند اذکار ہی عبادت نہیں بلکہ اس میں سونے جاگنے سے لے کر سیاست و معیشت اور تمام باہمی معاملات بھی شامل ہیں اور عبادت ہی ہمارا اصلی مقصد ہے۔تو اب فطری طور پر اگلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کیسے کی جائے؟ اس کا طریقہ کیا ہے کیونکہ کوئی عمل طریقے کے بغیر ممکن نہیں۔سوچنے کی بات یہ ہے ہم عبادت میں کسی خاص طریقے کے پابند ہیں یا اپنی مرضی سے طریقہ اختیار کر سکتے ہیں؟ یا جہاں سے بھی جو طریقہ اچھا لگے لے سکتے ہیں؟ ہر مذہب میں لوگوں نے اللہ کی عبادت کے لئے اپنے اپنے طریقے بنائے ہوئے ہیں۔جس نے جو طریقہ پسند کیا اسے عبادت کے لئے اپنا لیا۔حالانکہ پسند اللہ کی چلنی چاہئے۔

صوفیاء میں عبادت کے مختلف طریقے:

صوفیاء میں خاص طور پر عبادت کے لئے بہت سے مختلف طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔کسی نے رضائے الٰہی کے حصول کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہوا ہے کہ سانس روک کر ذکر کریں اور پھر کہتے ہیں کہ سانس ایسے نکالیں کہ تمہاری زبان ذکر نہ کرے۔تمہارے منہ اور زبان سے آواز نہ نکلے بلکہ تمہارے دل سے آواز نکلے۔تم جتنا اپنے دل کو چالو کرتے جاؤ گے، اتنا اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہوتا چلا جائے گا۔اسی طرح ایک نقشبندی طریقہ ہے اس سلسلے کے لوگ اپنے سامنے ایک نقش بنا کر رکھ لیتے ہیں۔اس پر ضربیں لگانا شروع کر دیتے ہیں اور پھر وہ دل پر ضربیں لگا لگا کر اپنے تئیں اللہ کا لفظ دل پر لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔اور اس کے اندر سے وہ اللہ اللہ کی آواز بھی نکالنے کی مشق کرتے ہیں۔

اس طرح کے مختلف طریقے صوفیاء نے اور دیگر لوگوں نے اپنی اپنی طرف سے بنائے ہوئے ہیں اور وہ انہی طریقوں کو ہی اللہ کی عبادت سمجھتے ہیں۔ان کی ساری محنت انہی طریقوں کو اپنانے پر ہی مسلسل جاری رہتی ہے۔ان کے نزدیک نماز، روزہ وغیرہ سب ظاہری عبادتیں ہیں۔اصل عبادات ان کے اپنے بنائے ہوئے طریقے ہوتے ہیں۔ان کے ہاں ظاہری اعمال یعنی نماز اور روزے کی خاص اہمیت نہیں ہوتی بلکہ وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم دل کی نماز پڑھتے ہیں۔ظاہری نماز کی اہمیت نہیں۔

نماز، روزہ اور اقامت دین:

اس طرح کی سنگین غلطی صوفیاء سے قدرے قریب ایک مذہبی حلقے میں پائی جاتی ہے۔انہوں نے نہایت اخلاص کے ساتھ اقامت دین کو اپنا مقصد قرار دیا ہے۔وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کو اقامت دین کے لئے ایک تیاری قرار دیتے ہیں۔نماز سے بھی ان کے نزدیک اقامت دین کے اصل مقصد کے لئے تیاری ہوتی ہے۔روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ سے بھی تیاری کا ہی کام ہوتا ہے۔یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ ان کے ہاں اصل عبادت یا مقصد نہیں۔اصل مقصد اور مقام ان کے ہاں اقامت دین کو حاصل ہے۔ان کے نزدیک اگر اقامت دین پیش نظر نہیں تو نماز، روزہ وغیرہ کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔

جہاں تک اقامت دین کا تعلق ہے تو اس کے لئے محنت اسلام میں بنیادی عمل اور عظیم فریضہ ہے۔اس کے لئے اخلاص کے ساتھ کی ہوئی ہر محنت عظیم عبادت ہے لیکن یہ نظریہ صحیح نہیں اقامت دین ہی اصل عبادت ہے اور نماز اور روزے کو صرف تیاری قرار دیا جائے جب کہ نبی ﷺ نے نماز اور روزے کو اسلام کا رکن قرار دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ ان ارکان کو قائم کرنا اسلام قائم کرنا ہے۔گویا کہ جو شخص نماز اور روزے کو قائم کرے گا...... وہی دین کو قائم کرے گا۔لیکن احباب گرامی سے غلطی یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے اصل مقصد حکومت کا قیام سمجھ لیا اور اسی ایک مقصد کے لئے محنت شروع کر دی۔ان کے ہاں اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ نماز کیسے پڑھی جائے۔جیسے کوئی پڑھ لے ان کے نزدیک سب طریقے درست ہیں۔اصل اہمیت

اقامت دین یعنی حکومت کے قیام کی ہے- پھر اسی طرح یہ غلطی بھی نمایاں ہوئی ہے کہ وہ حکومت کے قیام کے لئے ہر طریقے کو ہی جائز قرار دیتے ہیں- ان کے نزدیک جمہوریت اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں اگر مقصد اقامت دین ہو- ہم کہتے ہیں یہ منہجی غلطی ہے- ظاہر ہے غلبہ دین یا اقامت دین کی خاطر نبی ﷺ اور ان کے خلفاء کا ہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا- غیر اسلامی طریقے اختیار کر کے کبھی اقامت دین کا کام نہیں ہوا- اگر کسی اسلام پسند کو جمہوری طریقے سے حکومت مل بھی گئی تو اقامت دین کے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا- ایسی بہت سی موجودہ دور کی مثالیں ہمارے سامنے واضح ہیں- اس منہجی غلطی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ بہت سے اسلام پسند معیشت اور سیاست کو عبادت نہیں مانتے بلکہ دنیاوی ضرورت سمجھتے ہیں لہٰذا نفع کمانے اور حکومت حاصل کرنے کے ہر طریقے کو درست سمجھ لیتے ہیں- ہمارے نزدیک یہ سوچ ہی غلط ہے- حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کی معیشت و سیاست کو اللہ کی عبادت ہونا چاہئے اور ہر عبادت کے لئے اللہ اور رسول ﷺ کا بتایا ہوا طریقہ اختیار کرنا چاہئے چنانچہ جو بھی انسان دین میں عبادت کے لئے اپنے بنائے ہوئے طریقے ایجاد کرتا ہے- تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں میں اختلافات بڑھتے جاتے ہیں- ذہن مختلف ہوتے جاتے ہیں اور جو اللہ کے نبی ﷺ کے بتائے ہوئے جو طریقے ہیں وہ عموماً چھوٹتے چلے جاتے ہیں-

جہاں تک ''اللہ کی عبادت ہمارا اصل مقصد ہے'' کا تعلق ہے- تو اس کو پھر بھی بہت سے لوگ مان لیتے ہیں- لیکن زیادہ اختلاف اور بگاڑ اس پر ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کیسے کی جائے؟ وہ کونسا طریقہ ہے کہ جس کے تحت ہماری سیاست، ہماری معیشت، ہماری تجارت، ہماری معاشر ہمارے حقوق و فرائض کا پورا نظام اللہ کی عبادت بن جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کی عبادت ہم اس طریقے سے کریں جس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے-

اس کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جس کام کا حکم دیا ہے، اس کی پیروی کی جائے بلکہ اس کام کو انجام دینے کے لئے اللہ اور رسول ﷺ نے جو طریقہ بتایا ہے، اس کی پیروی بھی ضروری ہے- یعنی جس طرح احکام اللہ کی طرف سے ہیں، اس طرح احکام پر عمل کرنے کے طریقے بھی اللہ کی طرف سے ہیں- جس طرح نماز پڑھنے کا حکم اللہ کی طرف سے ہے تو اس کا طریقہ بھی اللہ کی طرف سے ہے- روزہ رکھنے کا حکم اللہ کی طرف سے ہے تو روزہ رکھنے کا طریقہ بھی اللہ کی طرف سے ہے- گویا ہر کام کا طریقہ اسلام میں شامل ہے-

سنت کی نسبت نبی ﷺ کی طرف کیوں؟

اللہ نے انبیاء کو مبعوث ہی اس لئے کیا تا کہ وہ لوگوں کو عمل کے طریقے بتائیں- مطلقاً احکام پہنچا دینا ہی ان کے ذمے نہیں تھا بلکہ ان احکام کی مراد اور ان پر عمل پیرا ہونے کا طریقہ بتانا بھی ان کے فرائض میں شامل اور نہ اگر انبیاء یہ کام نہ کرتے تو ہر ایک حکم کی کوئی کیا مراد لیتا اور کوئی کیا- کوئی ایک ہی حکم پر ایک طریقہ سے عمل پیرا ہوتا تو دوسرا کسی اور طریقے پر اور تیسرا کسی اور طریقہ پر- تو اس طرح احکام پر عمل کے طریقوں میں شدید اختلاف پیدا ہوتے- حقیقت یہ ہے کہ فرقے اسی بنیاد پر بنے ہیں- شریعت کی طرف سے ایسی گنجائش نہیں دی جاسکتی اللہ تعالیٰ نے جو بھی حکم نازل کیا ہے، اس کا مقصد اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو بتایا ہے- نبی ﷺ کے سوا دنیا میں کوئی بھی اس مقصد کو جاننے کا ذریعہ نہیں- گویا طریقہ کی ساری بحث نبی ﷺ کی طرف ہے-

سنت کا معنی طریقہ ہے- ہر عمل کا طریقہ جو اللہ پسند کرتا ہے کہ لوگ اختیار کریں- وہ نبی ﷺ بتاتے ہیں کیونکہ اللہ حکم دیتا ہے، عمل نہیں کرتا- اللہ نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا حکم دیتا ہے- نبی کے عمل اور طریقے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ کی مراد کیا ہے- اللہ تعالیٰ نے کہا اقیموا الصلواۃ تو عربی لغت صلوۃ کے مطلق معنی حرکات وسکنات ہے- مختلف حرکات کرنا ایک ہی حالت میں نہ رہنا بلکہ حالتوں کو بدلتے رہنا، اسے لغت میں صلوٰۃ کہا گیا ہے- اب اگر صلوٰۃ کے طریقے کے لئے نبی ﷺ سے رجوع نہ کیا جائے اور صلوٰۃ کا اپنا مفہوم نکالنے کی کوشش کی جائے اور اس پر عمل

کا طریقہ اختیا کیا جائے تو سوائے اختلاف اور انتشار کے کوئی چیز ہاتھ نہ آئے گی- اگر عقیدہ یہ رکھا جائے کہ نبی ﷺ کو اللہ نے جہاں نماز کا حکم دیا، وہاں نماز کا طریقہ سمجھانے کے لئے بھی جبریل کو بھیجا تھا اور جبریل نے نماز پڑھ کر دکھائی تھی اور نبی ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھی اور اسی طریقے پر پڑھنے کا حکم دیا تو اس سے امت میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہے گا اور سب ایک صحیح طریقے پر عمل کریں گے- اسی طرح سیاست، حکومت اور دیگر امور ہیں- گویا کہ ہماری عبادت تب اللہ کی صحیح عبادت ہوگی جب ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے احکام اور طریقوں کے مطابق عمل کریں گے- لیکن اپنی پسند سے جو بھی کوئی طریقے نکالے گا، وہ ہرگز صحیح عبادت نہ ہوگی- کوئی شخص اگر یہ کہے کہ دو ٹانگوں پر قیام کر لینا کون سی بڑی عبادت ہے، میں ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر قیام کروں گا تو یہ ہرگز اللہ کی صحیح عبادت نہیں کیونکہ نبی ﷺ نے ایسا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا- اسی طرح بعض لوگ سخت سردی کی راتوں میں یخ بستہ ٹھنڈے پانی میں کھڑے ہو کر عبادت کرنے کی کوشش کرتے ہیں- بعض لوگ چپ کا روزہ رکھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ عبادت ہے- کہیں کوئی اپنے اوپر ایک مدت کے لئے چولہے کی پکی ہوئی چیزیں کھانا حرام کر لیتا ہے- یہ طریقے ہندوؤں، سادھوؤں اور ہمارے ہاں بعض صوفیوں میں بھی رائج چلے آرہے ہیں- وہ اپنے اوپر زیادہ سے زیادہ مشقتیں ڈال کر اپنے تئیں عبادت کا ایک سخت اور پختہ دورہ کرتے ہیں- وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے اوپر جس قدر زیادہ مشقتیں ڈالیں گے، اسی قدر ہمارا ریاض، ہمارا گیان دھیان اور ہماری عبادت زیادہ مقبول اور زیادہ موثر نتائج کی حامل ہوگی اور ہم سلوک کی منازل جلد طے کر لیں گے- حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جو ایک ٹانگ، پر کھڑے ہو کر عبادت کرتا ہے وہ عقیدے کی خرابی میں مبتلا ہے- اس کی رہنمائی شیطان کر رہا ہوتا ہے- کیونکہ ایسے طریقے نبی ﷺ سے ثابت نہیں- اپنی طرف سے عبادت کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرنا بدعت ہے- یہ اللہ کی نافرمانی ہے- اسی لئے فرمایا گیا-

"یا ایھاالذین آمنو الا تقدمو بین یدی اللہ ورسولہ"

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے مت بڑھو-

"یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعو ا الرسول ولا تبطلو ا اعمالکم"

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو-

گویا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں عمل ہوگا تو عبادت ہوگی- اور جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں عمل نہ ہوگا، وہ باطل اور برباد ہوگا اس کا اللہ کے ہاں کوئی اجر نہیں ہوگا بلکہ قیامت کے دن ایسے اعمال پر عذاب ہوگا- انسان چاہے کتنا ہی اچھے سے اچھا اور خوبصورت عمل کرے- اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں نہ ہوگا تو وہ باطل ہی ہوگا- کوئی چاہے بے بہا صدقہ وخیرات کرے، لمبی لمبی نمازیں پڑھے، ساری ساری رات رکوع وسجود کرے لیکن اگر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اس کی عبادت نہیں تو وہ ضائع ہی ہوگی-

انس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ تین آدمی رسول اللہ ﷺ کے گھر آئے آپؐ کی عبادت کے متعلق پوچھا- جب انہیں بتایا گیا تو گویا انہوں نے اسے کم سمجھا- کہنے لگے- ہماری رسول ﷺ سے کیا نسبت؟ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے پہلے اور پچھلے سب گناہ معاف فرما دیئے ہیں- تو ان میں سے ایک نے کہا، میں ہمیشہ رات کو نماز پڑھوں گا- دوسرے نے کہا، میں ہمیشہ دن کو روزہ رکھوں گا- تیسرے نے کہا، میں عورتوں سے علیحدہ رہوں گا، کبھی نکاح نہیں کروں گا- آپؐ کو اطلاع ہوئی تو ان سے فرمایا، تم لوگوں نے یہ باتیں کہیں ہیں؟

یاد رکھو اللہ کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اس کا تقویٰ رکھنے والا ہوں لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور روزہ افطار کرتا ہوں اور نماز پڑھتا ہوں اور سوتا ہوں اور میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں تو جو شخص میرے طریقے سے بے رغبتی کرے، وہ مجھ سے نہیں-
(متفق علیہ بحوالہ مشکوۃ باب الاعتصام)

بھائیو! یہ بہت بڑی کسوٹی ہے حق وباطل کو پہچاننے کی- آپ کسی کو قبر میں چلہ کاٹتے یا ایسا کوئی کام کرتے دیکھو تو پوچھو کہ کیا تم نبی ﷺ سے زیادہ

متقی ہو؟ اور کیا زیادہ عبادت گزار ہو؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ہر عمل کا جو طریقہ سمجھایا ہے - وہی امت کے لئے صحیح ہے - کتب حدیث کا بغور مطالعہ کریں تو محدثین کرام نے عظیم خدمات انجام دے کر نبی اکرم ﷺ کے شب و روز کو اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ وہ امت کے لئے واضح اور مکمل لائحہ عمل ہے - اس میں عبادت سے لے کر معاملات اور سیاست وتجارت کے سب ابواب امت کے لئے قیامت تک راہنمائی ہیں - بعض لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ چونکہ یہ باتیں بہت پہلے کی ہیں' زمانہ اور حالات کے بدلنے سے سب چیزیں قابل عمل نہیں رہیں البتہ بعض چیزوں کو اب بھی وہ عمل کے لئے درست سمجھتے ہیں خصوصاً سیاسیات وسماجیات کو وہ الگ کر کے رائے زنی کرتے ہیں - سیاست وحکومت کو دین سے الگ کر کے سے دنیا کا کھیل بناتے ہیں کیونکہ نبی ﷺ نے سیاست وحکومت کے امور انجام دیئے ہیں اور پھر جماعت صحابہ وخلفاء نے ان امور کو نبی ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے پر انجام دیا ہے کتب حدیث میں پورا ذخیرہ بطور راہنمائی موجود ہے - پھر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم اس دور میں ہیں جب کفر کا غلبہ ہے - مسلمانوں کو غیر اسلامی نظاموں کے تحت رہنا پڑ رہا ہے - ایسے دور میں ہم راہنمائی کہاں سے لیں - تو ہم یہ کہتے ہیں' کیا انبیاء کے ادوار میں ایسے حالات نہیں تھے - انہوں نے غیر اسلامی نظاموں اور حکومتوں کے تحت زندگیاں بسر نہیں کیں اور کیا خاتم النبیین ﷺ پر ایسا دور نہیں آیا جب آپ کے پاس حکومت نہیں تھی اور کفر وشرک پھیلا ہوا تھا - پھر مکہ سے ہجرت کرنے کے بعد مدینہ میں پہنچ کر بھی نبی ﷺ کو یہود ومنافقین کی ریشہ دوانیوں کا سامنا تھا - آپ ﷺ نے افرادی قوت وسائل کو کیسے بڑھایا؟ مدینہ پر کیسے کنٹرول کیا؟ گردو پیش میں کیسے پہنچے؟ نظام کو کیسے ہاتھ میں لیا؟ وہ طریقہ کیا تھا؟ کون کہتا ہے کہ ہمیں نبی ﷺ سے اس سلسلے میں پوری راہنمائی نہیں ملتی - ایسے شخص کے عقیدے میں غلطی ہے اور یہیں سے منہج کی خرابیاں شروع ہو جاتی ہیں - اور منہج کی خرابی سے منزلیں کھو جاتی ہیں اور محنتیں ضائع ہو جاتی ہیں - اللہ محفوظ رکھے اور توفیق سے نوازے -

غلبہء دین اور نفاذ شریعت کے طریقے

قسط نمبر 3

پروفیسر حافظ محمد سعید حفظہ اللہ

عام لوگوں میں اجتماعی اور حکومتی امور میں منہج کی خرابی کی بڑی وجہ ہی یہ ہے کہ وہ سیاست و معیشت کو دین اور عبادت کے طریقوں میں شامل نہیں سمجھتے۔ حالانکہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں ہر شعبہ ہائے حیات میں مکمل رہنمائی دی ہے کہ جس پر چل کر ہماری سیاست و معیشت بھی اللہ کی عبادت میں داخل ہو جاتی ہے۔

شریعت کے مطابق حکومت کرنا بھی عبادت ہے

ہمارے ہاں ایک بڑا سوال اٹھایا جاتا ہے کہ ملک میں شریعت کیسے نافذ ہو سکتی ہے اور اسکا طریقہ کار کیا ہے؟ خود ہمارے حکمران بھی یہ سوال اٹھاتے رہتے ہیں کہ موجودہ حالات میں ہم شریعت کیسے نافذ کر سکتے ہیں؟ اس کا ہمیں طریقہ کار بتاؤ۔ اس سوال کو ہم بڑا مشکل سا سمجھتے ہیں اور اسکے جواب میں ہمارے بڑے بڑے علماء اور اسلام پسند دانشور بھی بڑا پیچیدہ سا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ دور از کار باتوں' فلسفوں اور ایسی بھول بھلیوں میں پڑ جاتے ہیں کہ اصل راہ ہی گم ہو جاتی ہے اور سوال کا جواب سوال سے بھی مشکل ہو جاتا ہے حالانکہ یہ بڑی سادہ سی بات ہے کہ کیا نبی ﷺ نے شریعت نافذ کی تھی یا نہیں؟ سب مانتے ہیں نبی نے شریعت نافذ کی تھی' پھر اگر کی تھی تو کیسے کی تھی' اس کا جواب بھی بآسانی مل سکتا ہے ہمارے نزدیک طریقہ کار سے لاعلمی اصل مسئلہ ہے ہی نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران شریعت کے قیام کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتے اور نہ ہی وہ حکومتی امور کو عبادت میں شامل سمجھتے ہیں۔ انہیں دراصل یہی احساس دلانے اور بتانے کی ضرورت ہے کہ وہ ایک مسلمان حکمران ہیں۔ دین کا قیام ان کا بنیادی کام ہے۔ ہر شعبے اور ہر معاملے میں نبی ﷺ کی پیروی ان پر فرض ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق حکومت کرنا بھی عبادت میں شامل ہے۔ اگر ایک مسلمان حکمران عقیدہ و عمل کے اعتبار سے ایسا پختہ ہو جائے اور وہ ایک بار طے کر لے کہ اس نے اللہ کے دین کے قیام کا ہی کام کرنا ہے تو اس کے لئے طریقہ کار وغیرہ کی کوئی مشکل نہیں رہے گی اور نہ کوئی اور مسئلہ ان شاء اللہ رکاوٹ بن سکے گا۔ لیکن یہ کام تب ہی ہو سکتا ہے جب وہ جان لے کہ جو آدمی حکمران بنتا ہے' وہ نبی ﷺ کا نائب بنتا ہے اور اس نے وہی کام کرنے ہیں جو نبی ﷺ نے بتائے ہیں بلکہ اسی طرح کہ جیسے جو آدمی مصلے پر کھڑا ہو کر نماز پڑھاتا ہے' وہ نبی کا نائب بن کر نماز پڑھاتا ہے۔ اور نماز اس طرح پڑھائے گا' جیسے نبی ﷺ نے پڑھائی۔ اپنی مرضی اور طریقے سے نماز نہیں پڑھا سکتا۔ اگر وہ کوئی غلطی کرتا ہے تو پیچھے سے مقتدی سبحان اللہ کہتا ہے یعنی اس پر پیچھے والے واضح کر دیتے ہیں کہ تم غلطی کر رہے ہو۔ یہ نبی ﷺ کا طریقہ نہیں تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اصل امام نبی ﷺ ہے۔ تم اس کے نائب ہو۔ غلطی کرو گے تو پیچھے سے اصلاح کریں گے۔ حاکم وقت کی پوزیشن بھی یہی ہوتی ہے جو مسجد کے امام کی ہوتی ہے۔ حکمران بھی حکومت کی نشست پر اللہ کے نبی ﷺ کا نائب اور مسئول بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ اپنی مرضی کرنے کا مختار نہیں ہوتا۔ جیسے مسجد کے امام کو نبی ﷺ کا طریقہ اپنانا ضروری ہے' ایسے ہی حکمران کیلئے بھی آپ ﷺ کے طریقہ کی اتباع لازمی ہے۔ تب ہی وہ مسلمان حاکم بنے گا اور یہی اس کا امتحان ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ سیاسی نظام انگلینڈ کا بہتر ہے' معاشی نظام جاپان سے لے لینا چاہئے اور اسی طرح تعلیم وغیرہ کے لئے کسی اور مغربی ملک کے نظام کو بہتر سمجھے اور یہ خیال کرے کہ انہی ملکوں کا نظام اپنانے سے ترقی ہو سکتی ہے تو یہ صریح گمراہی اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے بغاوت ہے۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہم اللہ کے نبی ﷺ کی پیروی کے پابند ہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے شریعت کو نافذ کیا اور مکمل طور پر نافذ کیا۔ حکمران کو بھی نبی ﷺ کے نائب ہونے کی حیثیت سے یہی کام کرنا ہے۔ وہ ایک بار اپنی یہ ذمہ داری جان لے' طریقہ بھی نبی ﷺ کا اختیار کر لے تو ابھی شریعت نافذ ہو جائے گی۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوگا۔ لیکن ہمارے حکمران اپنی اس بنیادی ذمہ داری کو شرح صدر سے سمجھتے ہی نہیں وہ اگر سمجھتے بھی ہیں تو خود کو نبی کا نائب سمجھنے کی بجائے اللہ کا نائب اور خلیفہ سمجھنے لگ جاتے ہیں حالانکہ اللہ کا

نائب اور اللہ کا خلفیہ کوئی نہیں بن سکتا۔ لیکن نفاذ شریعت کے معاملے میں پھر بھی پہلوتو ہی کرتے یا کہہ دیتے ہیں کہ ہم بے بس ہیں اور ہمارے لئے شریعت کا مکمل نفاذ ممکن نہیں۔

سوچیے انسان حاکم بھی ہو، حکومتی سہولتوں اور لذتوں سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھائے لیکن اخروی طور پر انسانوں کا بوجھ اپنے اوپر اٹھاتا چلا جائے، کس قدر افسوس ناک بات ہے۔ واللہ جتنے انسان ملک میں رہتے ہیں، ہر بندے کی نماز کا حساب حاکم نے دینا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے

الذين ان مكنهم فى الارض اقاموا الصلوة

جن کو ہم نے زمین میں اقتدار دیا ہے، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ نماز کو قائم کریں۔"

اگر حاکم یہ کام نہیں کرتا، لوگ نماز نہیں پڑھتے تو مجرم حاکم ہوگا۔ لیکن ہمارے حکمران اسے کوئی بات سمجھتے ہی نہیں۔ یہ سب عقیدے کی خرابیاں ہیں اور آخرت کا خوف نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اگر عقیدے میں پختگی ہو اور اس بات کا شعور ہو کہ اللہ کی شریعت کے مطابق حکومت کرنا بھی اللہ کی عبادت ہے اور یہ اللہ کی عبادت کا ایک بڑا اہم طریقہ اور ذریعہ ہے تو سب بگاڑ اور الجھنیں ختم ہو جائیں گی۔ حکمران یہ سمجھے کہ اللہ نے اس طریقے سے مجھے اپنی عبادت کا موقع دیا ہے جو دوسروں کو نہیں دیا بلکہ اس طرح میرے اوپر سخت امتحان آن پڑا ہے تو پھر اس امتحان سے سرخرو ہونے والوں کے لئے اللہ نے درجات بھی بہت اونچے رکھے ہیں۔ نبی ﷺ نے جن سات لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ قیامت کی سخت گرمی اور نفسانفسی کے دن جب زمین پگھل رہی ہوگی اور تانبے کی ہو رہی ہوگی اور سوائے اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے کے اور کوئی سایہ نہ ہوگا، اس دن انہیں اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سائے تلے جگہ دے گا تو ان میں ایک حاکم عادل بھی ہوگا۔ لیکن جس قدر درجہ بلند ہے، آزمائش اور پریشانی بھی اسی قدر زیادہ ہے۔ جواب دہی بھی اسی قدر زیادہ ہوگی۔

غرض حکمران شریعت کے نفاذ کے لئے پہلے یہ ذہن، عقیدہ اور منہج اختیار کریں تو آگے سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ لوگوں کے اندر بھی غلبۂ دین اور اس کے طریقہ کے بارے میں جو الجھنیں ہیں، وہ بھی اسی طرح رفع ہوں گی کہ ہم پہلے اپنا عقیدہ و منہج درست کریں اور ہر شعبے اور ہر معاملے میں نبی ﷺ کے طریقہ کی طرف دیکھتے چلے جائیں تو کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ غلبۂ دین یا کسی اور مسئلے کے بارے میں جو طریقہ اور معیار اس کے ذہن میں ہے اور جو حل اس کے پاس ہے، اگر دوسرا بھی یہی طریقہ اور یہی حل اس کے سامنے رکھے تو تب تو درست ہے ورنہ وہ اسے ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ حالانکہ طریقہ ہمارا چلے گا نہ تمہارا نہ کسی اور کا۔ طریقہ تو صرف رسول اللہ ﷺ کا چلے گا۔ ہم دراصل اپنے ذہنوں کو بدلنے کے لئے تیار نہیں۔ اپنے آپ کو اللہ کی شریعت کے تابع نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں یہ سمجھنا اور ماننا ہوگا کہ عام عبادات نماز، روزہ، حج وغیرہ کے طریقے ہوں یا سیاسی اور حکومتی امور، سب میں طریقہ وہی چلے گا جو اللہ نے بتا دیا اور رسول ﷺ نے عمل کر کے دکھا دیا۔

كما امرنا الله ورسوله

وہی عمل درست ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق ہیں اور جو ان کے خلاف ہیں، ان کے بارے میں متنبہ کر دیا گیا

و لا تبطلوا أعمالكم

"اپنے اعمال برباد نہ کرو۔"

ایسے اعمال قیامت کے دن نہ ترازو میں تلیں گے اور نہ دنیا میں ان طریقوں سے کوئی فائدہ ہوگا۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں، نبی ﷺ نے فرمایا:

مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ

''جوشخص ایسا عمل کرے جس پر ہمارا حکم نہیں تو وہ مردود ہے۔'' (مسلم)

اس حدیث کے الفاظ مَنْ عَمِلَ عَمَلاً میں بہت بڑا نکتہ ہے۔ یہاں صرف مَنْ عَمِلَ (جس نے کوئی عمل کیا) بھی کہا جاسکتا تھا لیکن فرمایا گیا مَنْ عَمِلَ عَمَلاً۔ یہاں عملاً کے آخر میں تنوین (ً) ہے۔ اور جہاں یہ تنوین آئے' اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا عمل۔ تنوین دونوں قسم کے اعمال کو محیط ہوتی ہے۔

گویا اب مذکورہ بالا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی بھی بڑا یا چھوٹا عمل جو ہمارے حکم یا ہمارے طریقے کے مطابق نہیں' وہ مردود ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مقبول نہیں ہے۔ نہ دنیا کے اندر ایسے اعمال میں اللہ برکت دے گا اور نہ آخرت میں ان کا کوئی وزن ہوگا۔

اس سلسلے میں ایسے اعمال کی بہت سی مثالیں ہیں کہ جنہیں بظاہر لوگوں نے بڑے نیک اعمال بنایا ہوا ہے لیکن حقیقتاً اللہ کے ہاں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ وہ ایسے مبتدعیانہ اور مشرکانہ اعمال ہوتے ہیں جو اللہ کی سخت ناراضگی اور غیض وغضب کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً درباروں پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں' کالے بکروں کا صدقہ کیا جاتا ہے' غیر اللہ کے نام کی منتیں مانی جاتی ہیں۔ یہ سب چیزیں صریح شرک کے اندر آتی ہیں۔ ایسے اعمال چاہے کتنا ہی اچھا نکتۂ نظر رکھ کر انجام دیئے جائیں لیکن چونکہ ان پر اللہ اور رسول ﷺ کی مہر نہیں ہوتی' اس لئے باطل اور مردود ہیں۔

اسلام نافذ کرنے کے لئے الیکشن کے طریقے کی شرعی حیثیت

اسی طرح سیاسی میدان کی بدعات اور خرافات ہیں۔ جمہوریت اور اکثریت کی بنیاد پر فیصلے کرنا اور قانون سازی کرنا بھی اسلام میں شرک ہے۔ لیکن ہمارے ہاں بعض اسلام پسند کہلانے والے لوگ الیکشن میں یہ کہہ کر حصہ لیتے ہیں کہ ہم منتخب ہو کر اسلام نافذ کرلیں گے۔ حالانکہ ان سے پوچھنا چاہئے کہ کیا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اسلام کے نفاذ کے لئے یہ طریقہ بتایا ہے۔ کیا آپ ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اسلام کے نفاذ کے لئے پہلے لوگوں سے پوچھا جائے کہ تمہیں اللہ کا دین چاہئے یا نہیں۔ اگر اکثریت چاہے تو نافذ کر دیا جائے ورنہ نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے بھٹو دور میں اس جمہوری نظام کی وجہ سے خوفناک صورتحال پیدا ہوگئی کہ مسلمانوں سے یہ پوچھا جانے لگا کہ تمہیں اسلام چاہئے یا سوشلزم۔ لوگوں نے سوشلزم کے علمبردار بھٹو کو ووٹ دے دیئے تو گویا یہ تاثر پیدا ہوا کہ اسلام کو مسترد کر دیا گیا۔ حالانکہ اسلام کو الیکشنوں میں گھسیٹنا اور اسے ووٹ کا محتاج بنانا ہی غلط ہے۔ یہ طریقہ تو لوگوں کے عقائد اور دین سے کھیلنے والی بات ہے۔ اگر اسلام کے نفاذ کے لئے الیکشنوں کے جمہوری نظام کو درست مان لیا جائے تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ اگر اسلام کو لوگ ووٹ دے دیں تو اسلام درست ہے ورنہ کسی دوسرے نظام کو ووٹ دیں تو وہ نظام درست ہوگا۔ اسلام معاذ اللہ درست اور برحق نہ ہوگا۔ حالانکہ لوگ اسلام کو ووٹ دیں یا نہ دیں' اسلام ہی ہر صورت درست اور برحق ہے اور دوسرا ہر نظام باطل ہے۔ اسلام لوگوں کے ووٹ اور ان کی اکثریت کی پسند ناپسند کا محتاج نہیں۔ اللہ نے اسلام کو لوگوں کی مرضی پر نہیں چھوڑا۔

ثم جعلنک علی شریعة من الامر فیتبعها و لا تتبع اهواء الذین لا یعلمون

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں' اے نبی' ہم نے آپ کو شریعت دی ہے۔ آپ ﷺ اس کا اتباع کریں اور ان لوگوں کی آراء اور خواہشات کے پیچھے نہ چلیں جنہیں دین کا پتہ ہی نہیں یعنی اللہ نے واضح کر دیا کہ یہ کوئی قاعدہ نہیں کہ لوگ اللہ کا حکم ہی مانیں' تب ہی وہ درست ہوگا بلکہ لوگ مانیں تب بھی اللہ کا حکم درست ہے اور نہ مانیں تب بھی اللہ کا حکم ہی درست ہے۔''

غلبۂ اسلام کا طریقہ جہاد ہے

لیکن جہاد جیسی عظیم عبادت بھی اللہ اور رسول ﷺ کے احکام کے مطابق کرنے سے قبول ہوگی

یہی معاملہ جہاد کا بھی ہے۔اللہ نے کافروں پر اسلام کے غلبے کے لئے جہاد کا طریقہ کار مقرر کیا ہے۔اگر یہ بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام وفرامین اور آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے مطابق ہوگا تو اللہ کے ہاں قبول ہوگا ورنہ یہ عمل بھی مردود ہوگا۔

سیدنا عمرؓ جب جہادی لشکر روانہ فرماتے تو کمانڈر کو یہی تلقین ہوتی کہ وہ کفار پر حملہ سے پہلے انہیں اسلام اور توحید کی دعوت دیں۔اگر وہ یہ دعوت قبول کر لیں تو پھر ان سے کوئی لڑائی نہیں ہوگی۔وہ ہمارے بھائی ہوں گے لیکن اگر وہ یہ دعوت قبول نہ کریں تو ان پر اپنا مذہب چھوڑنے کے لئے کوئی جبر نہ ہوگا۔کیونکہ اسلام میں یہ ہرگز جائز نہیں کہ کافروں کی گردن پر تلوار رکھ کر انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔البتہ ان پر حکومت اللہ کے دین اسلام اور مسلمانوں کی ہوگی اور انہیں اپنی جان و مال کی حفاظت کے عوض اسلامی ریاست کو جزیہ کی صورت میں ایک معمولی ٹیکس دینا ہوگا۔اگر وہ جزیہ بھی نہ دیں تو پھر فرمایا کہ اب تلوار ہی ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کرے گی۔اب ان کی پسند ناپسند نہیں چلے گی۔گویا اسلام نے کافروں پر غلبے کے لئے یہ راستے بتائے ہیں کہ پہلے انہیں دعوت دی جائے۔اگر وہ قبول نہ کریں اور جزیہ دے دیں' تو انہیں پھر بھی امان ہے۔البتہ اسلام کی حکومت کا ان پر غلبہ ہوگا لیکن اگر وہ جزیہ بھی نہ دیں تو تب تلوار اور جہاد کے ذریعے اسلام ان پر غالب آئے گا۔

جہاد سے پہلے کافروں کو دعوت دینے کا مسئلہ

یہاں پر بعض لوگ ایک شبہ پیدا کرتے ہیں کہ جب جہاد کے لئے پہلے کافروں کو دعوت دینا ضروری ہے تو کیا وجہ ہے کہ آج آپ جہاد کرنے سے پہلے کافروں کو دعوت دینے کا اہتمام نہیں کرتے تو ان بھائیوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ کشمیر کا جہاد دفاعی نوعیت کا جہاد ہے۔یہ ہجومی اور اقدامی جہاد نہیں یعنی جب مسلمان خود کافروں پر حملہ آور ہوتے ہیں تو یہ ہجومی جنگ ہوتی ہے۔ایسے جہاد میں طریقہ کار یہی ہوتا ہے کہ کافروں کو دعوت دے کر پہلے اتمام حجت کیا جائے۔اگر وہ نہ مانیں تو تب ان سے جزیہ لیا جائے گا اور جزیہ بھی نہ دیں تو تب تلوار کے ذریعہ فیصلہ کیا جائے گا۔لیکن جب مسلمان خود حملہ آور نہ ہوں بلکہ ان پر ظلم وستم ڈھایا جا رہا ہو' ان کی عصمتیں لٹ رہی ہوں' ان کی زمینوں پر کافر قابض ہوں اور کافر ان کا ہر لحاظ سے استحصال کر رہے ہوں' وہ بے چارے اپنی جان و مال اور عزتیں بچانے کیلئے دفاع پر مجبور ہوں تو ایسی حالت میں جہاد کا یہ طریقہ کار نہیں کہ پہلے انہیں اسلام کی دعوت دی جائے اور نہ ماننے پر پھر جہاد کیا جائے بلکہ اس صورت میں صرف اپنے دفاع کا حکم ہے کیونکہ یہاں جنگ کافروں نے مسلط کی ہے۔ظلم انہوں نے کیا ہے۔حقیقت بات یہ ہے کہ پوری دنیا میں آج جہاں جہاں جہاد ہو رہا ہے تو ہر جگہ مسلمان مظلومیت کی کیفیت میں ہیں۔یہاں اقدامی اور ہجومی جنگ و جہاد والی شرطیں چل ہی نہیں سکتیں کہ پہلے یہ مظلوم مسلمان دعوت دیں اور مکمل اتمام حجت کے بعد پھر اپنا بچاؤ شروع کریں۔کیا کسی کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ڈاکو اور بدمعاش کسی کی مال و جان اور عزت کے درپے ہوں اور وہ اپنے فوری بچاؤ کی تدبیر کرنے کی بجائے اسے اخلاقی لیکچر دینے میں مشغول ہو جائے۔یہ نہ عقل مانتی ہے اور نہ ہی یہ بات سیرت نبوی ﷺ سے ثابت ہے۔آپ نبی ﷺ کے ابتدائی غزوات اور دفاعی جنگیں ملاحظہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے ان جنگوں میں کہیں بھی یہ طریقہ اختیار نہیں کیا کہ پہلے کافروں کو دعوت دی ہو اور پھر ساری حجت پوری کرنے کے بعد کافروں کے خلاف تلوار اٹھائی ہو۔غزوۂ بدر' غزوۂ احد ہو' یا غزوۂ احزاب' کہیں بھی آپ ﷺ نے جنگ شروع ہونے سے پہلے کافروں کو دعوت نہیں دی۔غزوہ احزاب میں تو یہ صورت حال تھی کہ مسلمانوں نے خندقیں کھودی ہوئی تھیں' محصور ہو چکے تھے اور سخت پریشانی کا عالم تھا' کافر مسلمانوں کے گھر لوٹنے اور ان کی جان و مال اور عزتوں کے لٹیرے بن کر بڑی تیاری کے ساتھ حملہ آور تھے۔کیا کوئی ایک بھی حدیث دکھا سکتا ہے کہ نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ نے ایسے موقع پر کافروں کو پہلے دعوت دی ہو۔اس طرح کی صورتحال میں تو

ایسا ممکن ہی نہیں ہوتا۔اس لئے یاد رکھنا چاہئے کہ دفاع میں دعوت نہیں ہوتی' ہجوم میں دعوت ہوتی ہے۔غرض جب ہم ہر معاملے میں نبی ﷺ کے طریقوں کی طرف دیکھیں گے تو تب ہی ہماری ہر عبادت قبول ہوگی اور اس میں برکتیں بھی ہوں گی چاہے وہ نماز' روزہ' حج اور قربانی کا معاملہ ہو یا سیاست اور جہاد کا معاملہ۔اگر جہاد بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام اور طریقوں کے مطابق نہیں ہوگا تو وہ بھی اللہ کے ہاں مردود ہوگا۔

تلوار کے ذریعے اسلام پھیلنے کا اصل مطلب

یہاں پر برسبیل تذکرہ یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اگر مسلمان ہجومی اور اقدامی جہاد کریں' کافروں کو دعوت دے کر پہلے اتمام حجت کر لیں' پھر کافروں کے ساتھ جہاد کریں اور کافر مغلوب ہو جائیں' مسلمان زبردست طاقت میں آ جائیں تب بھی اس کا مقصد یہ نہیں ہوگا کہ اب کافروں کی گردن پر بندوق رکھ کر انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ مسلمان ہو جائیں۔اب بھی انہیں دعوت دے کر دلیل کے ذریعے مسلمان ہونے پر آمادہ کیا جائے گا۔کسی کافر کو ہم بندوق یا تلوار کے زور پر مسلمان بننے اور کلمہ پڑھنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔اور نہ کبھی اسلام تلوار کے زور پر اس طرح پھیلا ہے۔ہم جب کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور پر نہیں پھیلا تو اس کا اصل مطلب یہی ہے کہ کسی کو زبردستی مسلمان نہیں کیا گیا۔مسلمان جب جہاد کے ذریعے غالب آئے اور کافر مسلمان نہ بھی ہونا چاہتے تو انہیں اس کی مکمل آزادی دی جاتی البتہ انہیں اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے اسلامی ریاست کے تحت رہ کر جزیہ ضرور دینا پڑتا۔جہاد کا مقصد کافروں کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں ہوتا بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ کافروں کا وہ نظام' وہ قوت اور وہ ادارے اور وسائل جن کے ذریعے سے دنیا میں کفر قائم ہوتا ہے' ان سب کو جہاد کے ذریعے توڑ کر اللہ کے حکم کے آگے پست اور مجبور کر دیا جائے۔لوگ جن کافر قوتوں اور اداروں کے ڈر سے یا کسی خوف اور طمع یا مجبوری کی وجہ سے کفر کو نہیں چھوڑتے یا کسی اور رکاوٹ کی وجہ سے اسلام کی دعوت کو آزادانہ سمجھ اور اپنا نہیں سکتے تو ایسی تمام رکاوٹوں کو ہی جہاد کے ذریعے ختم کرنا مقصود ہوتا ہے۔جب یہ رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی تو پھر کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کی ضرورت نہیں رہتی اور نہ اس طرح بنایا گیا ہے بلکہ دنیا نے دیکھا کہ جب جہاد کے ذریعے یہ رکاوٹیں ختم ہو جاتی تھیں تو لوگ خود بخود اسلام کی طرف امڈ امڈ کر اور لپک لپک کر آتے تھے کیونکہ اسلام دین فطرت ہے اور کسی بھی عقل سلیم رکھنے والے انسان کو اسلام کی دعوت کو آزادانہ سمجھنے کا موقع ملے تو وہ اسے اپنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔اسلام کے غلبے کی صورت میں اگر کافر پھر بھی اپنے کفر پر قائم رہنا چاہیں تو انہیں اسلام اس کی آزادی دیتا ہے اور صرف ان سے جزیہ لیا جاتا ہے اور اس حد تک جہاد کرنا مسلمانوں کے لئے لازمی بھی ہوتا ہے کہ جس کے نتیجے میں کافر کم از کم جزیہ دینے پر تیار ہو جائیں۔سورہ توبہ میں اللہ نے فرمایا:

قاتلوا الذين لا يومنون بالله ولا باليوم الآخر ولايحرمون ما حرم الله ورسوله ولايدينون دين الحق من الذين اوتوا الكتب حتى يعطوا الجزية عن يد وهم صغرون.

''(مسلمانو!) ان لوگوں کے خلاف قتال کرو جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے۔جو اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ شئے کو حرام نہیں جانتے نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے۔یہاں تک قتال کرو کہ وہ اپنے ہاتھ سے تمہیں جزیہ ادا کریں۔ اور وہ تمہارے سامنے چھوٹے (ذلیل اور پست) ہو جائیں۔(التوبہ۔29)

''دین میں جبر نہیں'' کا مطلب

مذکورہ بالا آیت سے واضح ہو گیا کہ جہاد کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے باغی کافر مسلمانوں کے مقابلے میں چھوٹے' پست اور ذلیل ہو جائیں۔ مسلمان کافروں کے مقابلے میں بڑے اور حاوی ہو جائیں۔کافر مسلمانوں کو جزیہ دینے پر مجبور ہو جائیں لیکن یہ مقصد نہیں کہ کافروں کو زبردستی مسلمان بنانا ہے بلکہ کفر کو توڑنا اصل مقصد ہے۔

قاتلوھم حتی لا تکون فتنة .

قتال کا مقصد فتنے کا خاتمہ ہے۔کفر وشرک کی قوت جس کی وجہ سے فتنے پھیلتے ہیں اور کفر کے ادارے اور نظام مضبوط ہوتے ہیں تو اس قوت کو ختم کرنا جہاد کا اصل مقصد ہوتا ہے۔اس قوت کے خاتمے سے ہی لوگوں کے لئے دعوت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور لوگ خود بخود مسلمان ہوجاتے ہیں۔قرآن نے قتال فی سبیل اللہ کے یہی مقاصد بتائے ہیں کہ

1۔ فتنے کا خاتمہ ہو

2۔ کافروں سے جزیہ لیا جائے

3۔ اور کافروں کو ذلیل کر کے ان کی قوت چھین کر حکومت اپنے ہاتھ میں لی جائے

جہاد وقتال کے ان مقاصد میں کافروں کو زبردستی مسلمان کرنا کہیں بھی نہیں اور نہ اس کی ضرورت پڑتی ہے۔لا اکراہ فی الدین دین میں جبر نہیں' تو اس کا اصل مطلب یہی ہے کہ کافروں پر جہاد کے ذریعے سیاسی غلبہ تو حاصل کیا جائے گا' اسلام کی دعوت کی راہ میں رکاوٹیں تو ختم کی جائیں گی لیکن کسی کو تلوار کے زور پر مسلمان نہیں کیا جائے گا۔جب جہاد کے ذریعے دعوت کے دروازے کھلتے ہیں تو لوگ الحمدللہ خود ہی اس دین فطرت کو قبول کر لیتے ہیں۔

قسط نمبر 4 پروفیسر حافظ محمد سعید حفظہ اللہ

کیا اللہ کی عبادت خوف اور طمع (جہنم کے ڈر اور جنت کے لالچ وغیرہ) کے ساتھ نہ کی جائے؟

عام لوگوں کے ہاں بہت بڑا غلط اور گمراہ کن عقیدہ پایا جاتا ہے کہ اللہ کی عبادت جہنم کے ڈر یا جنت کے لالچ وغیرہ کے ساتھ نہیں کرنی چاہئے۔ اس سلسلے میں بعض بڑے بڑے صوفی شاعروں نے اس گمراہ کن عقیدے کے حق میں بہت سے شعر بھی بنائے ہوئے ہیں۔ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جنت کے لالچ یا جہنم کے ڈر سے اللہ کی عبادت کرنا یا کوئی نیک عمل کرنا شرک ہے۔ حالانکہ اس بے بنیاد عقیدے کی آڑ میں خود ان صوفیاء نے شرک کے بڑے بڑے دروازے کھول رکھے ہیں۔ اللہ نے قرآن کریم میں بڑی وضاحت کے ساتھ مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

يدعون ربهم خوفا وطمعا

وہ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں۔ (السجدہ 16/32)

یعنی مومنین اپنے رب کی عبادت خوف اور لالچ کے ساتھ کرتے ہیں۔

خود نبی ﷺ سے مروی ہے۔ آپ نے فرمایا

اسئال الله الجنة واعوذ به من النار

میں اللہ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور دوزخ سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ (رواہ صحیح ابوداؤد)

مذکورہ حدیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جنت کے حصول کی تمنا کرنا اور دوزخ سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ مانگنا خود نبی ﷺ سے ثابت ہے لیکن بعض صوفیاء اس کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف اللہ کی رضا کے حصول کیلئے عبادت کرنی چاہئے۔ جنت دوزخ کو ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس میں خودغرضی آجاتی ہے۔ حالانکہ حدیث رسول ﷺ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ خود نبی ﷺ جنت کا سوال اور جنت کی خواہش وتمنا کرتے تھے۔ اسی طرح جہنم سے پناہ مانگتے۔ جب یہ بات نبی ﷺ سے ثابت ہے تو پھر ہم اس مسئلے میں اپنی عقل اور اپنا فلسفہ پیش کرنے کی جرأت کیوں کریں؟ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں جہنم کے عذاب سے ڈر کر اور جنت کے حصول کے لئے اللہ کی عبادت نہیں کر رہا' وہ دراصل ایک گھمنڈ اور تکبر کا شکار ہوتا ہے۔ وہ یہ ظاہر کر رہا ہوتا ہے کہ مجھے جنت دوزخ کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں ان چیزوں سے بے غرض ہوں۔ حالانکہ اللہ نے انسان کو اپنا غرض مند اور محتاج بنایا ہے۔ اللہ کو اپنے آگے سوال کرنے والا غرض مند انسان ہی پسند ہے۔ بے نیازی انسان کی نہیں' صرف اللہ کی شان ہے۔ شیطان نے انسان کے اندر وسوسہ ڈالا کہ جنت کے حصول اور جہنم سے بچنے کے لئے اللہ کی عبادت کرنا خودغرضی ہے لیکن دراصل اس وسوسہ کی آڑ میں اسے متکبر بنادیا۔ اور اسے عملاً اس گمراہ کن فلسفے میں ڈال دیا کہ تو جنت کا محتاج نہیں اور نہ تو اللہ کے عذاب اور جہنم سے ڈرتا ہے۔ تکبر ابلیس کی گمراہی کی سب سے بڑی وجہ تھی اور انسانوں کو بھی وہ زیادہ سے زیادہ اسی گمراہی کے زیر دام لانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ صوفیاء اس فلسفے کے سب سے زیادہ اسیر ہیں۔ چنانچہ آپ ان کے حالات میں دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ تکبر انہی میں پایا جاتا ہے۔ باقی انسان اگر اللہ کی عبادت زیادہ نہیں کرتے' اللہ کے حقوق کی کما حقہ ادائیگی نہیں کرتے تو اسے وہ اپنی کمی' کمزوری یا کوتاہی وغیرہ قرار دیتے ہیں لیکن صوفیاء کے ہاں حال یہ ہے کہ وہ جوں جوں تصوف کی منزلیں اور مدارج طے کرتے جاتے ہیں' نماز روزہ وغیرہ کی عبادت کو وہ اپنے لئے غیر ضروری سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ انہیں وہ ظاہری عبادات کا نام دے دیتے ہیں۔ اور جو مخصوص قسم کے وظائف اور طریقے عبادت کے لئے خود انہوں نے آپ گھڑے ہوتے ہیں' انہیں وہ اصل اور باطنی عبادت کہتے ہیں۔ دراصل یہ شیطان کا ڈالا ہوا ایسا وسوسہ ہے کہ پہلے تو انہیں جنت دوزخ کی فکر سے آزاد کیا۔ انہیں بے نیاز

اور متکبر کیا۔ پھر نماز' روزہ وغیرہ کو ظاہری عبادت کا نام دلا کر ان سے انہیں پرے کیا یعنی اللہ کی عبادت سے دور کر دیا اور پھر ان سے خود ساختہ عبادت کے طریقے ایجاد کرائے اور انہیں اصل اور باطنی عبادت کا نام دے کر انہیں اپنی اطاعت کے لئے پورا پورا اسیر کر لیا۔ یہ ہے تکبر کا انجام جبکہ اللہ کی عبادت کی بنیاد ہی عاجزی اور انکساری ہے اور تکبر عبادت کے بالکل الٹ اور منافی ہے۔

جب انسان اللہ سے محتاج ہو کر مانگتا ہے کہ اللہ مجھے فلاں چیز دے۔ مجھے فلاں نعمت دے۔ جنت دے تو اللہ سے یہ لالچ رکھنا' اللہ سے مانگنا اور اللہ کے آگے خود کو محتاج اور سوالی بنا کر پیش کرنا یہ بندے کے لائق ہے۔ اور اسی سے اللہ خوش ہوتا ہے کہ بندے اس سے مانگیں اور وہ ان کے سوال پورے کرے۔ اس سے خالق کی قوت وقدرت اور مخلوق کی محتاجی و بےبسی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی سے خالق اور مخلوق میں فرق نمایاں ہوتا ہے۔ ایک بیٹا ہے جو باپ سے مانگتا ہے۔ عموماً والدین کو اپنے بچے کی ضرورت اور خواہش کا علم ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ اپنے بچے کی زبان سے اس کی خواہش سن کر زیادہ خوش ہوتے ہیں اور اس کی جائز خواہش کو جلد پورا کرنے کی بھرپور کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن ایک بیٹا اپنے باپ سے مانگنا پسند نہیں کرتا۔ وہ بڑی بے پروائی اور بے نیازی سے کہتا ہے کہ میں کیوں باپ سے مانگوں؟ مجھے اس سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب بتائیے یہ بیٹا باپ کو اچھا لگے گا یا وہ جو بڑے لاڈ پیار اور انکساری کے ملے جلے جذبات کے ساتھ باپ سے مانگتا ہے؟

اللہ سے کچھ نہ مانگنا اور دعا نہ کرنا تکبر ہے

بہت سے لوگ کہتے ہیں' ہمیں اللہ سے کچھ نہیں مانگنا چاہیئے۔ کیا اللہ کو نہیں پتہ کہ ہماری کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ وہ اللہ سے دعا ہی نہیں مانگتے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں

ادعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین

(لوگو!) مجھ سے دعائیں کیا کرو۔ میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا۔ جو لوگ مجھ سے مانگنے سے تکبر کرتے ہیں' یقین مانو' وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ (المومن۔60)

اس آیت سے واضح ہو گیا کہ جو اللہ سے نہیں مانگتا' وہ متکبر ہے۔

اگر جنت کا لالچ رکھنا اور جہنم سے پناہ مانگنا جائز نہ ہوتا تو پھر اللہ کے قرآن میں جہاں کہیں جنت کا ذکر آتا ہے تو اسے بڑی خوبصورتی سے بیان نہ کیا جاتا۔ قرآن میں جنت کے مناظر' اس کے رنگا رنگ پھل' میووں' دودھ اور شراب سے لبالب نہروں' چھپے ہوئے موتیوں جیسی حوروں اور تاحد نظر عالیشان محلات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ہمیشہ کیلئے رنج وغم اور پریشانیوں کے خاتمے کی بات کی جاتی ہے۔ اس طرح جب جہنم کا ذکر آتا ہے تو اس کی زبردست ہولناکی اور شدت کا بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی پھنکاریں مارتی ہوئی آگ' اس کی خوفناک گہرائی' لہو' پیپ اور تھور وزقوم کے درختوں کی صورت میں وہاں کے کھانے اور پینے کے لئے کھولتے ہوئے پانی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

انسانوں کو سیدھی راہ پر رکھنے کے لئے لالچ' ڈر اور ترغیب وترھیب کا یہ انداز خود اللہ نے قرآن کریم میں اختیار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آخرت کا یہ ڈر اور جنت کی طمع انسان میں نہ رہے' یہ عقیدہ' سوچ اور فکر انسان کے ذہن سے نکال دی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اسے جزا سزا کا کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔ پھر اس کے لئے گناہ ثواب کے سب کام برابر کی حیثیت اختیار کر جائیں گے۔ نیکی بدی میں کوئی تمیز نہ رہے گی۔ انسانی معاشرے کو اللہ نے اسی سزا و جزا کے عقیدے کی بنیاد پر ایک پابند معاشرہ بنایا ہے اور اگر یہ عقیدہ اٹھ جائے تو پھر معاشرہ تمام اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر جانوروں کے معاشرے کا منظر پیش کرنے لگے گا۔

جو لوگ دنیا کے لالچ میں آ کر آخرت کے لالچ سے بے پرواہ ہو جاتے ہیں' اللہ کو پکارنا اور اس سے پناہ مانگنا چھوڑ دیتے ہیں' قیامت کے دن

ان کے حال کا دردناک نقشہ قرآن کریم نے کھینچا ہے۔ وہ جہنم میں اللہ کو پکاریں گے۔ وہاں کی ہولناک آگ سے نجات مانگیں گے۔ دنیا میں تو اللہ کو پکارنا اور اللہ سے مانگنا عار سمجھتے تھے۔ سزا و جزا کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ برا بھلا جیسا عمل چاہا کر لیتے تھے لیکن جہنم کا مزہ چکھتے ہی پکار اٹھیں گے کہ اے اللہ ہمیں ایک بار دنیا میں پھر بھیج دے۔ اب ہم تجھے ہی پکاریں گے۔ تجھ سے ہی مانگیں گے۔ تیری ہی عبادت کریں گے۔ تمام برے کام اور اپنی بنائی ہوئی عبادتیں، طریقے اور فلسفے چھوڑ دیں گے۔

فقالوا يليتنا نرد ولا نكذب بايت ربنا ونكون من المومنين

پس کہیں گے، ہائے کیا اچھی بات ہو کہ ہم پھر واپس بھیج دیئے جائیں اور اگر ایسا ہو جائے تو ہم اپنے رب کی آیات کو جھوٹا نہ بتلائیں اور ہم ایمان والوں میں سے ہو جائیں۔ (الانعام۔27)

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات کی حقیقت کھولتے ہوئے بیان فرمایا

بل بدالهم ما كانوا يخفون من قبل ولوردوا لعادوا لما نهوا عنه وانهم لكذبون

بلکہ (یہ سب باتیں اب وہ اس لئے کرنے لگے ہیں کہ) جس چیز کو اس سے پہلے دبایا کرتے تھے (جہنم سے بے پرواہ تھے) وہ (اب) ان کے سامنے آ گئی ہے، اور اگر یہ لوگ پھر واپس بھیج دیئے جائیں، تب بھی یہ وہی کام کریں گے جن سے ان کو منع کیا گیا تھا اور یقیناً یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ (الانعام۔28)

چنانچہ یہ جہنم میں اللہ کو پکار پکار کر تھک جائیں گے لیکن اللہ ان کی طرف کوئی توجہ نہ کرے گا بلکہ کہا جائے گا۔ انا نسینکم آج ہم نے تمہیں بھلا دیا۔ (السجدہ۔14) جس طرح دنیا میں تم ہمیں پکارنا فراموش کئے ہوئے تھے، ہم بھی آج تمہاری کوئی پکار نہیں سنیں گے۔ جب دوزخی سمجھ لیں گے کہ آج بار بار مانگنے کے باوجود اللہ ان کی دعا قبول نہیں فرماتا بلکہ کان بھی نہیں لگاتا تو بالآخر جہنم کے داروغوں کو پکاریں گے۔ انہیں کہیں گے

ادعوا ربكم يخفف عنا يوما من العذاب

تم ہی اپنے پروردگار سے دعا مانگو کہ وہ کسی دن تو ہمارے عذاب میں کمی کر دے۔ (مومن۔49)

ونادوا يٰملك ليقض علينا ربك

اور پکار پکار کر کہیں گے، اے مالک (جہنم کے داروغے!) تیرا رب ہمارا کام ہی تمام کر دے۔ (الزخرف۔77)

قال انكم ما كثون

وہ (جہنم کا داروغہ) کہے گا کہ (ظالمو!) تمہیں تو (اب یہیں) رہنا ہے۔ (الزخرف۔77)

مذکورہ بالا ان تمام آیات و احادیث سے ثابت ہوا کہ ایک مومن اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ اس کے دل میں آخرت اور جہنم کے عذاب کا ڈر ہو اور اللہ سے جنت کے حصول کی شدید تمنا ہو، تب اس کی عبادت صحیح ہوگی۔ اور جو جہنم سے بچنے اور جنت کو مانگنے کی تمنا دل میں رکھنے اور اللہ سے مانگنے اور دعا کرنے کو عار سمجھتے ہیں، وہ تکبر کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کی عبادت کسی طور درست نہیں ہوتی۔

بعض شبہات کا ازالہ

کیا صرف لا الہ الا اللہ کہنے والا جنت میں داخل ہو جائے گا اور اسے اعمال کی ضرورت نہیں ہوتی؟

شبہ:۔ حدیث میں آتا ہے کہ

من قال لا اله الا الله دخل الجنة

جس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ (ابن حبان۔ صحح الالبانی السلسلۃ الصحیحۃ 2355)

اس حدیث کی رو سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر کلمہ گو چاہے وہ کتنا ہی بے عمل ہو یا اس کی عبادت کا طریقہ کچھ بھی ہو اور وہ جنت دوزخ کی فکر رکھے یا نہ رکھے، جنت بہر حال اسے ملے گی؟

ازالہ:۔ اس کی تشریح دیگر احادیث میں موجود ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔

☆ انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ ما من احد یشھد ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ صادقا من قلبہ الا حرمہ اللہ علی النار۔ (متفق علیہ)

جس کسی نے لا الہ الا محمد رسول اللہ کی شہادت سچے دل سے دی اسے اللہ آگ ہر حرام کر دے گا۔ (بخاری و مسلم)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ من لقیک من وراء ھذا الحائط یشھد ان لا الہ الا اللہ مستیقنا بھا قلبہ فبشرہ بالجنۃ۔ رواہ مسلم

جو شخص لا الہ الا اللہ کی شہادت دے اس حال میں کہ اس کا دل اس یقین رکھنے والا ہو اسے جنت کی بشارت دو۔ صحیح مسلم

اس حدیث کے مفہوم میں سلف کے ہاں بہت بحث کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر سب نے اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جتنی بھی شریعت ہے، سب لا الہ الا اللہ کا حصہ ہے۔ صحابہ کرام نے اس کی عملی تفسیر پیش کی۔ آپ دیکھ لیں کہ جو صحابی بھی لا الہ الا اللہ کہتا تھا، وہ نماز پڑھتا تھا۔ ایک بھی صحابی نماز کا تارک نہ تھا۔ کسی بھی صحابی نے اس حدیث کی تفسیر یہ نہیں سمجھی کہ جس نے لا الہ الا اللہ پڑھ لیا، وہ جنت میں داخل ہو گیا لہذا اب اسے نماز اور دیگر عبادات کی ضرورت نہیں یا کوئی یہ سمجھا ہو کہ وہ اب لا الہ الا اللہ صدق دل سے پڑھ کر ایمان کے ایسے درجے پر پہنچ گیا ہے کہ اب اسے ظاہری عبادات کی حاجت نہیں۔ ایسی خود ساختہ تشریحات اور تاویلات صحابہ کرام ث اور سلف صالحین میں سے کسی نے بھی اختیار نہیں کیں۔ بلکہ نماز تو صحابہ کرامث میں مسلمان اور کافر کے درمیان فرق قائم کرنے کا معیار تھا۔ اسی طرح وہ روزہ، زکوۃ، حج اور جہاد جیسے فرائض اور عبادات کی ادائیگی بھی برابر کرتے تھے۔ وہ ان تمام عبادات اور پوری شریعت کو لا الہ الا اللہ کے اندر داخل سمجھتے تھے۔

اس حدیث کا ایک دوسرا مفہوم جو سلف کے ہاں لیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ جس نے بھی لا الہ الا اللہ کہہ دیا، اس میں گو بہت سی کمیاں کوتاہیاں ہوں، بہت سے گناہ کئے ہوں لیکن وہ دوزخ میں ہمیشہ کے لئے نہیں جائے گا بلکہ اپنے گناہوں کے مطابق دوزخ میں سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں ضرور جائے گا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں بھی آتا ہے کہ یخرج من النار من قال لا الہ الا اللہ وفی قلبہ وزن ذرۃ من خیر۔

جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اس کے دل میں ذرہ برابر بھی خیر (ایمان) موجود ہوگا تو اسے جہنم سے نکال دیا جائے گا۔ (بخاری)

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ لا الہ الا اللہ کہنے والے بھی کئی لوگ جہنم میں جائیں گے تب ہی انہیں جہنم سے نکالنے کی بات کی گئی ہے۔ سلف میں سے بھی یہ مطلب کسی نے نہیں لیا کہ لا الہ الا اللہ کہنے والا جو چاہے عمل کرتا رہے، اسے اپنے اعمال کے بقدر دوزخ میں کسی صورت سزا نہیں ملے گی اور وہ دوزخ میں جائے بغیر سیدھا جنت میں چلا جائے گا۔ یہ مفہوم سلف نے کہیں بھی اختیار نہیں کیا۔

کیا حقوق العباد پورے کرنے کافی ہوتے ہیں اور کیا محض انہی حقوق کی ادائیگی سے حقوق اللہ یعنی نماز روزہ وغیرہ معاف ہو جائیں گے

شبہ:۔ بعض لوگ کہتے ہیں، حقوق اللہ تو معاف ہو جائیں گے لیکن حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے۔ یعنی نماز، روزہ وغیرہ کا کوئی اہتمام نہ بھی کرے لیکن اگر اس نے صرف حقوق العباد پورے کئے ہوں تو اللہ اسے جنت میں لے جائے گا۔

ازالہ:۔ حقوق العباد کی ادائیگی مسلمان بھی کرتے ہیں اور غیر مسلم بھی کرتے ہیں لیکن ہماری اور ان کی ادائیگی میں ایک جوہری اور بنیادی فرق ہے۔ ہم اگر حقوق العباد کی ادائیگی کرتے ہیں، ماں باپ کا احترام کرتے ہیں، اپنے ہمسائیوں، دوستوں، رشتہ داروں، تعلق داروں اور دیگر انسانوں کے حقوق

پورے کرتے ہیں تو اس لئے کہ ہمیں یہ اللہ کا حکم ہے۔ اگر کوئی لوگوں کی دیکھا دیکھی اور معاشرے کی روایات کی وجہ سے یہ حقوق پورے کرتا ہے' اللہ کا حکم سمجھ کر یہ حقوق پورے نہیں کرتا تو اللہ کے ہاں اسے ان حقوق کی ادائیگی کا آخرت میں کوئی اجر نہیں ملے گا۔ کیونکہ اس نے ایسا معاشرے کی روایات کی وجہ سے کیا ہے۔ اگر یہ روایات بدل جائیں تو یہ بھی ماں باپ کے احترام وغیرہ کی روایات بدل لے یا یہ روایات نہ ہوتیں تو یہ بھی سرے سے ان کا کوئی احترام نہ کرتا۔ مسلمان اور کافر میں فرق ہی یہی ہے کہ مسلمان حقوق العباد کی ادائیگی بھی اللہ کا حکم سمجھ کر کرتا ہے۔ اب معاشرے کی روایات' قوانین اور رسوم ورواج چاہے جس قدر بھی بدل جائیں' مسلمان ہر حالت میں ماں باپ کا احترام اور دیگر انسانوں کے حقوق بدستور پورا کرنے کا پابند ہوگا۔ حالات کی تبدیلی اسے ان حقوق کی ادائیگی سے نہیں روک سکتی۔

جب حقوق العباد کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہم انہیں اللہ کا حکم سمجھ کر ہر حالت میں ادا کرتے ہیں تو پھر جس اللہ نے یہ حکم دیا ہے' اس کا حق سب سے پہلے ہے۔ باقی سب کے حقوق اس کے بعد ہیں۔

اللہ اور اس کے رسول کے بعد سب سے زیادہ حق ماں باپ کا ہے لیکن اس کے باوجود اللہ نے قرآن کریم میں فرمادیا

وان جاھدٰک علی ان تشرک بی ما لیس لک بہ علم فلاتطعھما

اور اگر تیرے ماں باپ تجھ پر زور دیں کہ میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک ٹھہرا جن کا تجھ کو علم نہیں تو (اس کام میں) ان کا کہنا نہ مانو۔ (لقمان۔15)

اسی طرح نبی ﷺ نے فرمایا:

لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (مسلم)

جہاں خالق کی نافرمانی کرنی پڑے' وہاں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔

یعنی ماں باپ کے ساتھ اگر ہم حسن سلوک کرتے ہیں تو اس لئے کہ یہ اللہ کا حکم ہے لیکن اگر یہ ماں باپ شرک وکفر پر مجبور کردیں تو اس معاملے میں ان کی اطاعت نہ کرنے کا حکم ہے اسی طرح دیگر مخلوق یعنی استاذ' حاکم' امام' مولوی وغیرہ کے معاملے میں بھی یہی اصول ہے کہ ان کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہے۔ گویا حقوق العباد کی ادائیگی بھی اللہ کے حکم کے تابع ہے۔ اس لحاظ سے اللہ کا حق زیادہ ہے۔ اگر کوئی حقوق العباد پورے کرتا ہے' بندوں کو ان کے حقوق کے معاملے میں راضی کرتا ہے تو اس لئے کہ یہ بھی اللہ کا حکم ہے۔ اگر اللہ کا حکم نہ ہوتا تو بندوں کے حقوق پورے کرنے اور انہیں راضی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے اصل اہمیت تب بھی اللہ کے حکم کو ہی حاصل ہے۔ حقوق العباد کو اللہ کے حکم اور اللہ کے حقوق پر پھر بھی کوئی فوقیت حاصل نہیں ہوتی۔ جب حقوق العباد کو حقوق اللہ پر کوئی ترجیح نہیں تو پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس نے حقوق العباد میں کوئی کمی کی اسے تو معاف نہ کیا جائے لیکن اللہ کا حق جس نے کوئی بھی پورا نہ کیا ہوُا سے معاف کردیا جائے۔

یہ مسئلہ ہم ایک اور اہم دلیل سے واضح کرتے ہیں۔ اللہ کا سب سے بڑا حق اس کی توحید کا اقرار کرنا ہے۔ اس کے بارے میں اللہ نے فرمایا

ان اللہ لایغفر ان یشرک بہ ویغفر مادون ذلک لمن یشاء

اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں بخشے گا۔ اس کے سوا جو چاہے گا' گناہ بخش دے گا۔ (النساء۔16)

اب اللہ تعالیٰ نے اپنے حق یعنی توحید کو نہ ماننے والے کو تو ناقابل بخشش قرار دیا ہے لیکن اس کے سوا جو چاہے گناہ بخشنے کا اعلان کیا ہے۔ حقوق العباد کے متعلق ایسا اعلان کہیں بھی نہیں ملتا کہ جس نے بندوں کا فلاں فلاں حق ادا نہ کیا تو اسے نہیں بخشا جائے گا۔ اس لئے ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ حقوق اللہ کی اہمیت حقوق العباد سے زیادہ ہے۔ نماز' روزہ وغیرہ ادا کرنا کسی صورت معاف نہیں۔ اور نہ کوئی مسلمان یہ انداز اختیار کرے کہ میں چونکہ حقوق العباد پورے کرتا ہوں' صدقہ خیرات اور رفاہ عامہ کے بہت کام کرتا ہوں' اس لئے اب مجھے نماز' جہاد' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کی ضرورت نہیں۔ میں حقوق اللہ ادا کئے بغیر ہی بخشا جاؤں گا۔ یہ سراسر گمراہ عقیدے اور شیطان کے وسوسے ہیں۔

قسط نمبر 5 لیکچرز: پروفیسر حافظ محمد سعید حفظہ اللہ

عبادت میں احسان

ما ھو الاحسان فی العبادۃ یعنی عبادت میں احسان کیا ہے؟......الاحسان ھو مراقبۃ اللہ تعالیٰ فی العبادۃ

عبادت میں اللہ کی مراقبت احسان ہے۔گویا کہ انسان اللہ کی عبادت اس احساس کے ساتھ کرے کہ وہ اللہ کی نگرانی میں ہے۔اس سے عبادت میں انہماک اور خشوع پیدا ہوتا ہے۔یہی عبادت میں احسان ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

الذی یرٰک حین تقوم وتقلبک فی الساجدین

اللہ تجھے دیکھتا ہے جب تو اکیلا قیام کی حالت میں ہوتا ہے اور جب تو جماعت میں لوگوں کے ساتھ ساتھ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔(الشعراء۔218-219)

اور نبی ﷺ نے فرمایا

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔اور اگر یہ نہ ہو کہ تم اسے دیکھتے ہو تو وہ یقیناً تمہیں دیکھتا ہے۔(مسلم)

لغوی طور پر احسان حسن سے ہے۔حسن کا معنی اچھائی اور خوبصورتی ہے۔گویا احسان کا معنی کسی چیز کو خوبصورت اور اچھا بنانا ہے۔مذکورہ آیت وحدیث میں احسان کا مقصود یہی بتانا ہے کہ ہم اپنی عبادت کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت' دلآ ویز اور بہتر کیسے بنا سکتے ہیں کیونکہ جب ہم اللہ کی عبادت کر رہے ہیں تو یہ عبادت بہت اچھی ہونی چاہئے۔نماز' روزہ ہو' دعا اور ذکر ہو یا دعوت و جہاد' عبادت کی ہر قسم میں بہت زیادہ انہماک اور توجہ ہونی چاہئے۔توجہ کیلئے یہ احساس دلایا گیا ہے کہ عبادت کرنے والا اپنے آپ کو اللہ کے سامنے پائے۔جب وہ محسوس کرے گا کہ اللہ میرے سامنے ہے یا میں اللہ کے سامنے ہوں' اللہ میرے ظاہر اور باطن کو دیکھ رہا ہے' وہ میری نیت کو جانتا ہے تو مکمل طور پر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔اس سے عبادت میں خشوع پیدا ہوگا۔اور انسان لذت محسوس کرے گا۔یاد رکھنا چاہئے کہ عبادت میں خشوع اور انہماک عبادت کا رکن ہے۔اور عبادت میں اپنے آپ کو اللہ کی طرف کامل متوجہ کر لینا اور ہر نقص دور کر کے عبادت کو بہترین بنانا احسان ہے۔

احسان کے متعلق حدیث جبریلؑ بہت مشہور ہے۔سیدنا عمرؓ اس حدیث کے راوی ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے۔اچانک ایک آدمی آیا جس کے کپڑے بہت سفید تھے اور بال بہت سیاہ تھے۔اس پر سفر کا کوئی اثر نہ تھا نہ ہی ہم اسے پہچانتے تھے۔(یعنی اگر دور سے آیا ہوتا تو اس پر سفر کے آثار ہوتے' اگر قریب سے آیا ہوتا تو ہم میں سے کوئی اسے جانتا ہوتا) وہ نبی ﷺ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ رانوں پر رکھ لئے (بہت مؤدب ہو کر بیٹھا) اور کہا' اے محمد (ﷺ) آپ مجھے اسلام کے متعلق بتائیے (اسلام کیا ہے؟) نبی ﷺ نے فرمایا ......تم شہادت دو کہ اللہ کے سوا عبادت کا کوئی مستحق نہیں اور محمد (ﷺ) یقیناً اللہ کے پیغمبر ہیں۔اور نماز کو صحیح طور پر ادا کرو اور اپنے مال کی زکوۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو اور بشرط توفیق بیت اللہ کا حج ادا کرو۔اس نے کہا۔صَدَقْتَ آپ (ﷺ) نے سچ فرمایا۔ہمیں تعجب ہوا کہ پوچھتا بھی ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے۔(یعنی اسے معلوم ہے تو پوچھتا ہی کیوں ہے اور اگر معلوم نہیں تو تصدیق کیسے کرتا ہے) پھر کہا' آپ (ﷺ) مجھے ایمان کی بابت بتائیے تو آپ ﷺ نے فرمایا......تم اللہ کے وجود پر یقین رکھو اور فرشتوں' اللہ کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان لاؤ اور تقدیر کی اچھائی اور برائی پر ایمان لاؤ۔اس نے کہا' آپ (ﷺ) نے سچ فرمایا۔پھر کہا' آپ (ﷺ) بتائیں' احسان کیا ہے' فرمایا' تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔اگر یہ نہ ہو تو یوں سمجھو کہ وہ تمہیں یقیناً دیکھ رہا ہے۔اس نے کہا' آپ (ﷺ) مجھے قیامت کے متعلق

بتائیں۔(یعنی قیامت کب ہوگی) فرمایا' جس سے سوال کیا جارہا ہے' وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔اس نے کہا' اس کی نشانیاں بیان فرمائیں۔فرمایا۔لونڈی اپنی مالکہ کو جنے گی (یعنی اولاد ماں پر حکومت کرے گی اور والدین کی نافرمان ہوگی یا مالک اپنی نوکرانیوں کے ساتھ زنا کریں گے اوران سے اولاد ہوگی) اور تمہیں معلوم ہوگا کہ ننگے پاؤں والے' ننگے بدن والے' تنگدست' بکریاں چرانے والے' عظیم الشان عمارتیں بنائینگے۔ پھر وہ آدمی چلا گیا۔میں تھوڑی دیر وہیں ٹھہرا رہا۔ نبی ﷺ نے فرمایا۔عمرص جانتے ہوئیہ سائل کون تھا۔میں نے عرض کیا۔اللہ اوراس کا رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں۔فرمایا' یہ جبرئیل تھے۔تمہیں دین سکھانے کیلئے تشریف لائے تھے۔(مسلم)

ایک مسلمان کے لئے دین کا کم ازکم اتنا علم اور عمل ضروری ہے

مذکورہ حدیث میں اسلام کے پانچ ارکان کا بیان ہوا ہے جن پر عمل کرنا ضروری ہے اور ایمانیات سے متعلق چھ چیزیں بیان کی گئی ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔

یہ دین کے عقیدہ اور عمل سے متعلق کل گیارہ چیزیں ہیں محدثین اور شارحین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایک مسلمان کے لئے دین کا کم ازکم اتنا علم حاصل کرنا اور سیکھنا ضروری ہے اور جو اسلام کی ان گیارہ چیزوں یعنی چھ ایمانیات اور پانچ ارکان کو نہیں مانتا یا کسی ایک کا انکار کرتا ہے' وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔کیونکہ عقیدہ وایمان اور عمل سے متعلق یہ چیزیں دین کی بنیاد ہیں اور انہی پر دین کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔جو شخص یہ نہیں جانتا کہ نماز کیا ہے؟ اسے کیسے ادا کرنا ہے' روزہ رکھنے کا طریقہ کیا ہے' حج کیسے ادا کیا جائے گا' زکوۃ کا نصاب اور ادائیگی کا طریقہ وغیرہ کیا ہے تو ان چیزوں کو جانے اور سیکھے اور عمل کئے بغیر کوئی شخص کیسے پہچانا جا سکتا ہے کہ یہ مسلمان ہے۔ہمارے ہاں سکول وکالجز وغیرہ میں یہ حدیث تو بڑے اہتمام سے پڑھائی جاتی ہے کہ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم۔(ابن ماجہ) بلکہ اس کے ساتھ ومسلمۃ کے لفظ کا اضافہ بھی کیا جاتا ہے حالانکہ مسلمۃ کے الفاظ حدیث میں نہیں ہیں۔ویسے بھی عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ عام طور پر جہاں صرف مذکر مخاطب ہو تو اس میں مؤنث بھی خودبخود شامل ہوتی ہے۔بہرحال یہ حدیث تو بیان کی جاتی ہے کہ ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا فرض ہے اور یہ علم جو ہر مسلمان پر فرض ہے' وہ یہی دین کا بنیادی علم ہے لیکن عملاً ہمارے ان تعلیمی اداروں میں یہ حدیث پڑھائے جانے کے باوجود سارا زور بے دینی سیکھنے' کافروں کے فلسفے' عشقیہ شعروادب یا محض دنیاوی معلومات وفنون کے حاصل کرنے پر دیا جاتا ہے۔

نماز' ورزش اور اٹھک بیٹھک کے لئے نہیں

عقیدہ وعمل کی ان بنیادی باتوں کے ذکر کے بعد حدیث جبریل ں میں تیسری اہم چیز احسان کے متعلق بتایا گیا ہے یعنی اس بات کا ذکر ہے کہ ہماری عبادت میں خوبی کیسے پیدا ہوگی؟۔ہم اپنی عبادت میں اتنی خوبصورتی اور حسن کس طرح لائیں کہ اللہ کے ہاں یہ مقبول ہو جائے۔گویا یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ ہم اپنی نماز کو مجبوری یا ڈیوٹی کے انداز میں رسماً ادا نہ کریں کہ بس تھوڑا سا اٹھیں' بیٹھیں' جھکیں اور سلام کر کے نکل جائیں۔ہماری عبادت اٹھک بیٹھک کا نام نہیں ہے۔بعض لوگ اسے ورزش کے طور پر بھی ادا کرتے ہیں۔نماز سے یقیناً ورزش کا ضمنی فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن ہماری عبادت کا اصل مقصد ورزش کرنا نہیں۔جو اس نیت سے نماز ادا کرتے ہیں' اللہ کے ہاں ان کی ایسی عبادت مقبول نہیں ہو سکتی۔ نماز ہمیں ورزش کے لئے نہیں' اللہ کے حکم کی اطاعت سمجھ کر ادا کرنے کا حکم ہے۔اوراس کی ادائیگی میں حسن بھی تب ہی پیدا ہو سکتا ہے جب اسے اللہ کا حکم سمجھ کر اللہ اوراس کے رسول ﷺ کے طریقے کے مطابق ادا کیا جائے۔ہر عمل کو شریعت کے مطابق اچھے سے اچھے طریقے سے ادا کرنا ہی عبادت کا تقاضا ہے۔

نماز میں خیالات ووساوس کی وجہ

ہمارے ہاں عام طور پر بہت سے لوگوں میں یہ الجھن پائی جاتی ہے کہ نماز کے دوران انہیں مختلف خیالات بہت آتے ہیں اوران کی توجہ نماز

میں یکسوئی نہیں ہوتی ۔ تو اسی توجہ اور خشوع وخضوع کو پیدا کرنے کے لئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے یہ طریقہ بتایا کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم یہ یقین رکھو کہ اللہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے۔ جب انسان کے اندر یہ یقین پیدا ہوجاتا ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہے ہیں' اس کی نگرانی فرمارہے ہیں' اس کی ایک ایک حرکت حتیٰ کہ قلب وذہن کے خیالات بھی اس کے علم میں ہیں تو انسان کے اندر خود بخود عبادت میں یکسوئی پیدا ہوجاتی ہے۔ ادھر ادھر کے وساوس چھٹ جاتے ہیں۔ اللہ کی طرف دھیان بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس توجہ اور خشوع وخضوع سے پھر اللہ کے ذکر اور اللہ کی عبادت میں لذت بھی بہت بڑھ جاتی ہے۔ پھر ایسا نہیں ہوتا کہ انسان نماز کے لئے آئے اور ہاتھ باندھتے ہی ہزار ہا قسم کے خیالات میں کھو جائے۔ اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ امام نے کون سی سورۃ پڑھی ہے' کون سی رکعت چل رہی ہے۔ بس ایسے کھڑا ہو جیسے اسے مجبوراً کسی نے نماز کیلئے باندھ دیا ہو۔ یا مشینی انداز میں اپنی حرکات کرے اور چلا جائے۔ جب اللہ کی نگرانی کا یقین ہوجائے تو پھر انسان کی یہ حالت نہیں رہتی۔ اس کی عبادت رسمی نہیں ہوتی۔ روح سے خالی نہیں ہوتی۔ انسان کا اللہ سے تعلق جس قدر مضبوط ہوگا' اللہ سے محبت جس قدر زیادہ ہوگی' اس کی نگرانی کا یقین جس قدر زیادہ ہوگا' اسی قدر اس کی عبادت میں لذت بڑھتی جائے گی۔

جو لوگ نماز کو محض اٹھک بیٹھک بنا لیتے ہیں اور بڑی تیزی سے رکعتیں پوری کرتے ہی بھاگ اٹھتے ہیں' انہیں یاد رکھ لینا چاہئے کہ ان کی نماز درست نہیں ہوتی۔ بخاری ومسلم میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک شخص نے ایسے ہی نماز پڑھی۔ آپ ﷺ نے اسے فرمایا فصل فانک لم تصل تو نماز پڑھ۔ ابھی تو نے نماز نہیں پڑھی۔ وہ دوبارہ نماز پڑھنے لگ گیا۔ نماز پڑھ کر پھر آپ ﷺ کے پاس آ کر سلام کہا۔ آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا فصل فانک لم تصل نماز پڑھ۔ ابھی تو نے نماز نہیں پڑھی۔ اس نے تیسری مرتبہ پھر ویسے ہی نماز پڑھی۔ آ کر سلام کہا۔ آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا فصل فانک لم تصل تو اب اس نے کہا۔ اے اللہ کے رسول' مجھے نماز سکھا دیجئے۔ پھر آپ ﷺ نے اسے نماز کے ایک ایک رکن کی ادائیگی کا طریقہ سکھایا کہ ہر رکن کو اس طرح ادا کر کہ جس سے تجھ میں پوری طرح اطمینان (ٹھہراؤ) پیدا ہوجائے۔ آپ ﷺ کے الفاظ تھے۔ حتیٰ تطمئن راکعا...... حتیٰ تطمئن ساجدا تو رکوع میں ہو یا سجدے میں' ہر رکن پورے اطمینان سے ادا کر۔ اگر دو سجدے کئے جائیں تو ان کے درمیان بھی آپ ﷺ نے اطمینان سے بیٹھنے کا حکم دیا۔ لیکن ہمارے ہاں کسی رکن کی اچھے طریقے سے ادائیگی کا کوئی اہتمام نہیں۔ بڑی تیزی سے رکعتیں ادا کرتے ہیں۔ اگر امام کے پیچھے ہوں تو کئی نمازی امام کے برابر چلتے ہیں اور کئی تو ہر رکن میں امام کو بھی پیچھے چھوڑتے چلے جاتے ہیں۔ جو کہ جائز نہیں۔ انہیں سوچنا چاہئے کہ امام سے پہلے وہ نماز سے فارغ تو ہو نہیں سکتے۔ پھر نماز میں اس قدر تیزی کا فائدہ کہ اپنی نماز کا حلیہ بھی بگاڑا' اجر بھی گنوایا اور امام سے پہلے پھر بھی فارغ نہ ہوسکے۔ خسر الدنیا والاخرۃ حالانکہ نماز میں امام کے ساتھ نہ برابری کرنی چاہئے اور نہ اس سے آگے بڑھنا چاہئے۔ نماز جلدی جلدی ادا کرنے سے اجتناب کرنا چاہئے کیونکہ حدیث میں واضح طور پر آتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے (نماز میں) کوّے کی طرح ٹھونگیں مارنے سے منع فرمایا۔ (ابوداؤد' مسند احمد) آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ چوری کے اعتبار سے سب سے برا چور نماز کا چور ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا' یارسول اللہ (ﷺ) وہ کیسے چوری کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا' جو نہ نماز کا رکوع پورا کرے اور نہ سجدہ۔ (مسند احمد)

اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں اپنی عبادتوں میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کا جو طریقہ بتایا ہے' آئیے اسے اختیار کر کے اپنی عبادت کو ضائع ہونے سے بچالیں' وہ طریقہ یہی ہے جیسا کہ حدیث میں وضاحت سے بتایا گیا کہ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ گویا اللہ کو دیکھ رہے ہیں یا کم از کم یہ یقین پیدا کریں کہ اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اور ہماری ایک ایک حرکت اس کی نگاہ میں ہے۔ ان شاء اللہ جب یہ یقین پیدا ہوگا اور اللہ کے رسول ﷺ کے طریقے کے مطابق عبادت ہوگی تو اس میں خود بخود خشوع وخضوع' توجہ' دھیان اور حسن پیدا ہوگا اور یہی عبادت میں احسان ہے۔

کیا اللہ کو دنیا میں دیکھا جاسکتا ہے؟

احسان کی آڑ میں بندے کو رب بنانے والے گمراہ کن فلسفوں کا تذکرہ

شبہ۔احسان کے بارے میں مذکورہ بالا حدیث جبریلں سے بعض لوگ یہ مراد لیتے ہیں کہ اگر اللہ کا کوئی خاص ذکر یا عبادت خاص انداز میں کی جائے تو اللہ کو دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے؟

ازالہ:۔

احسان کے بارے میں حدیث جبریلں سے بعض لوگوں نے یہ مراد لی ہے کہ اللہ کو ہم دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔صوفیاء نے تو اپنے مسلک تصوف کی بنیاد ہی احسان پر رکھی ہے۔ وہ اپنے مخصوص اذکار اور عبادت کو اپنے مخصوص انداز میں کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ اس طریقے سے انسان اللہ کی عبادت کرتا ہوا اللہ کے اتنے قریب ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کو دیکھتا ہی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے درمیان تمام فاصلے بھی مٹ جاتے ہیں۔یہ صوفیا اللہ اور بندے کے درمیان فرق ہی کو مٹا دیتے ہیں۔ان کے نزدیک انسان عبادت کرتا ہوا اللہ سے اس قدر قریب ہو جاتا ہے' اس کی رضا اور اطاعت میں اس قدر ڈھل جاتا ہے کہ بندے اور رب کے درمیان فرق ختم ہو جاتا ہے۔بندہ رب بن جاتا ہے اور رب بندہ۔(معاذ اللہ) صوفیا میں یہ نظریہ وحدت الشھو د کے نام سے مشہور ہے۔

اس کیلئے انہوں نے اپنی خانہ ساز تاویلات اور فلسفہ کے علاوہ بعض متشابہ قرآنی آیات واحادیث کا سہارا بھی لیا ہوا ہے۔اور ان کا مفہوم بگاڑ کر پیش کیا ہے۔اسی فلسفے سے انہوں نے حلول کا مشرکانہ عقیدہ نکالا ہے کہ اللہ کی ذات بندے کی ذات میں گم ہو جاتی ہے یا وہ کہتے ہیں کہ روح کا وصال اللہ سے ہو جاتا ہے۔یعنی بندہ عبادت میں اس قدر ترقی کرتا ہے کہ اس کی روح اللہ کی روح سے مل جاتی ہے اور دونوں یعنی خالق مخلوق میں معاذ اللہ فرق مٹ جاتا ہے۔اس لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ صوفیاء کے ہاں کوئی مرجائے تو وہ یہ کہنے کی بجائے کہ وہ فوت ہو گیا ہے' وہ کہتے ہیں اس کا اللہ سے وصال ہو گیا ہے یا مختصرا کہتے ہیں کہ فلاں بندہ وصال فرما گیا ہے۔اور اب یہ فقرہ عام بھی استعمال ہوتا ہے جس سے بچنا چاہیئے۔اسی طرح احسان' وصال اور اتحاد کی بہت سی اصلاحات ایجاد کر کے بہت سی گمراہیاں پھیلائی گئی ہیں اور ان پر عملدرآمد کیلئے ذکر وفکر کے بہت سے طریقے اختیار کئے ہوئے ہیں۔دل چالو کئے جاتے ہیں اور مراقبہ ہال بنا بنا کر مشقیں کروائی جاتی ہیں۔بہت سے لوگوں کو سکون حاصل کرنے کے لئے یہ طریقے بتائے جاتے ہیں۔ایسے تکلفات نبی ﷺ اور صحابہؓ سے ثابت نہیں۔اور ظلم یہ ہے کہ ہندی اور ایرانی فلسفے اور تصوف کو اسلامائز کرنے کیلئے قرآنی آیات واحادیث اور اولیائے کرام کے اقوال کو تاویلات کے ذریعے توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔حالانکہ حلول' وحدت الوجود' وحدت الشھو د اور وصال اور روح کے اتحاد وغیرہ کی تمام اصلاحات ہندی ویدوں اور ایرانی فلسفے سے آئی ہیں۔چونکہ ہندوستان میں ہندو مذہب پھیلا ہوا تھا اور اکثر لوگ ہندوؤں سے ہی مسلمان ہوئے تھے۔علم کی کمی اور عقیدے کی ناپختگی کی وجہ سے اسلامی عقیدہ راسخ نہ ہو سکا تھا۔اس لئے ہندوؤانہ سلسلے بہت حد تک ہمارے معاشرے میں پائے جاتے ہیں جیسے شادی بیاہ اور مرنے جینے کی بہت سی رسموں میں ہندو تہذیب کا رنگ موجود ہے۔ایسے ہی عقائد میں ہندوؤانہ عقیدے موجود ہیں۔اسی طرح ہندوستان میں فارسی ادب نے بہت سی گمراہیاں پھیلائی ہیں۔ایرانی فلسفہ فارسی کتب کے ذریعے ہندوستان میں پہنچا۔لمبا عرصہ ہندوستان کے حکمران فارسی بولنے والے تھے۔جہاں سے فارسی زبان اور فارسی لٹریچر عام ہوا اور ان کے ساتھ فارسی فلسفہ نے مسلمانوں کو متاثر کیا۔لہذا عقیدے کی بہت سی خرابیوں کی بنیاد میں ایرانی فلسفہ بھی شامل ہے۔افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں قرآن وحدیث جو اصل اسلام ہے' کی طرف بہت کم توجہ ہے حتی کہ بہت سے دینی مدارس میں بھی قرآن وحدیث سے زیادہ فلسفہ ومنطق اور معانی وکلام کو اہمیت دی جاتی ہے اور انہیں ہی زیادہ وقت دیا جاتا ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ دینی طبقے میں بھی قرآن وحدیث پر عمل کرنے کی بجائے تاویلات اور قیاسات واجتہادات پر عمل کیا جاتا ہے۔اس سے شخصیت پرستی نے جڑ پکڑی ہے اور لوگ فرقہ بندی اور تشدد وتعصب کی راہ پر چلے ہیں اور اسلام کی اصل پر قائم نہیں رہے۔حقیقت میں یہی وجہ ہے کہ اسلام ہمارے علاقوں میں قائم نہیں ہو سکا اور لوگ اختلافات کا شکار رہے۔ہم اگر تاریخ اسلامی کا مطالعہ کریں تو عباسی دور میں ہمیں یہ صورت نظر آتی ہے کہ عام لوگ بدعات کا شکار ہوئے۔قرآن وحدیث پر تمسک کی بجائے فلسفوں اور تاویلات کا

رواج ہوا۔علماءفلسفوں کے پیچھے چل پڑے اورعقلیات نے اصل دین کی جگہ لے لی اورتصوف عام ہوگیا تو خلافت اسلامیہ بھی قائم نہ رہ سکی۔۔ وہی صورت آج ہم دیکھتے ہیں۔خاص طور پر برصغیر میں تاویلات اورفلسفیانہ بدعات کا بڑا زور ہے جس سے اسلام کی شوکت وقوت متاثر ہوئی ہے۔ ضروری ہے کہ عوام الناس کو باطل تاویلات سے ہٹا کر قرآن وحدیث کی طرف لایا جائے۔اورٹھوس عقیدے پر بنیاد رکھی جائے۔یہی ٹھوس بنیاد اسلام کے شجرہ طیبہ کوآسمان کی بلندیوں تک پہنچائے گی اور زمین کے ہرکونے میں پہنچا کر انسانوں کوسایہ مہیا کرے گی۔اسی سے دعوت کا منشا پورا ہوگا اور جہاد کی بہارآئے گی۔حقیقت یہ ہے کہ مروجہ تبلیغی عمل سے برصغیر میں فرقے تو پھیلے ہیں لیکن اسلام نہیں پھیلا۔امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے کہ اسلام کے اصل قرآن وحدیث کی طرف لوٹے اوردعوت وجہاد کے عمل سے آگے بڑھے تاکہ اللہ کا دین غالب ہواور روئے زمین امن پرقائم ہو

اب سوال یہ ہے کہ کیا حدیث جبرئیل میں احسان سے یہ مراد لی جاسکتی ہے کہ انسان اللہ کودیکھ سکتا ہے؟

اس سلسلے میں اگر دیگرآیات واحادیث کوسامنے رکھا جائے تو اس عقیدے کی سراسرنفی ہوتی ہے کہ کوئی اپنی آنکھوں سے اللہ کودنیا میں دیکھ سکتا ہے۔اصول بھی یہی ہے کہ ایک آیت یا حدیث سے بات واضح نہ ہوتو دیگرآیات واحادیث سے مدد لی جاتی ہے۔ویسے خوداس حدیث کے الفاظ پربھی اگر پوری طرح غورکیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ نبی ﷺ نے قطعاً یہ نہیں کہا کہ احسان سے یہ مراد ہے کہ انسان اپنی آنکھوں سے اللہ کو دیکھ سکتا ہے۔یہ الفاظ آپ دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔آپ ﷺ نے فرمایا۔

الاحسان ان تعبد الله كانك تراه

احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کی جائے کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔

یہاں الفاظ ہیں ''گویا تم اسے دیکھ رہے ہو''یعنی تم اسے دیکھ تو نہیں سکتے لیکن اپنی عبادت میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کے لئے اور یہ یقین لانے کیلئے کہ اللہ میری نگرانی کررہا ہے تو اس مقصد کیلئے کہا گیا کہ تم عبادت ایسے کروکہ تم یہ سمجھوکہ گویا تم اللہ کودیکھتے ہو۔یہ بات ہم ایک مثال سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔مثلاً کوئی استادشاگردکو یاباپ اپنے بیٹے کونصیحت کرتا ہے کہ تم شراب نہ پینا یا فلاں برائی نہ کرنا اوراگرکروگے تو یوں سمجھ لوکہ جیسے میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔تو یہ تصورکرنے کے بعد کوئی بیٹا ایسی برائی نہیں کرے گا کیونکہ باپ کے سامنے کوئی بیٹا شراب نہیں پی سکتا لیکن اس سے کوئی یہ نتیجہ اخذ نہیں کرسکتا کہ باپ ہر برائی کرتے وقت واقعتاً بیٹے کے سامنے بنفس نفیس موجود ہوگا۔یہی معاملہ اس حدیث میں ہے کہ اللہ کو اپنے سامنے دیکھنے کا مقصد اس کو اپنا نگران سمجھنے اور عبادت میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کے لئے ہے اوراللہ تو ویسے بھی ہروقت ہرجگہ ہرایک کی نگرانی کرتا بھی ہے اگرچہ وہ ہرایک کے سامنے بنفسہ یا بذاتہ موجود نہیں ہوتا کیونکہ اللہ بنفسہ تو عرش پر ہی موجود ہے جیسا کہ قرآن کا فیصلہ ہے۔

الرحمن على العرش استوى

رحمٰن عرش پرمستوی ہے۔ (طہ۔۵)

اسی طرح قرآن میں واضح طور پراللہ کا یہ اعلان موجود ہے کہ لاتدرکہ الابصاروھو یدرک الابصار۔

اس (اللہ) کا کوئی نگاہ احاطہ نہیں کرسکتی اوروہ سب نگاہوں کو محیط ہوجاتا ہے۔ (الانعام۔103)

یعنی اللہ سب کودیکھتا ہے لیکن اللہ کوکوئی نہیں دیکھ سکتا۔بخاری ومسلم کی مختلف روایات میں آتا ہے کہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی عنہا سے مسروقؒ نے پوچھا کہ جب رسول اللہ ﷺ معراج پرتشریف لے گئے'اللہ سے ملاقات کی تو کیا انہوں نے اللہ کودیکھا تھا؟ توسیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا'سبحان اللہ'میرے تورونگٹے کھڑے ہوگئے (اس بات کوسننے سے) پھرآپ رضی اللہ عنہا نے مسروقؒ کوقرآن مجید کی اسی آیت کا حوالہ دیتے ہوئے جواب دیا کہ کیا تو نے نہیں سنا' اللہ تعالی نے فرمایا لاتدرکہ الابصاروھو یدرک الابصارمسلم کی روایت میں ہے' سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے مسروق کوفرمایا' جوکوئی سمجھے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کودیکھا ہے'اس نے اللہ پرجھوٹ باندھا۔

موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر نے بھی دنیا میں اللہ سے دیدار کی فرمائش کی تھی لیکن اللہ نے انہیں کہہ دیا لن ترانی تو مجھ کو ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔(الاعراف۔143) تاہم موسیٰ علیہ السلام اور دنیا کے تمام لوگوں پر یہ بات ثابت کرنے کیلئے کہ دنیا میں اللہ کے دیدار کا کوئی شخص متحمل نہیں ہوسکتا' اللہ نے کوہ طور پر اپنی تھوڑی سی تجلی ڈالی تو وہ ریزہ ریزہ ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام بھی بے ہوش کر گر پڑے۔

ایسی اور دیگر مختلف آیات واحادیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دنیا میں کوئی آنکھ اللہ کا دیدار نہیں کرسکتی البتہ جنتیوں کو آخرت میں اللہ کا دیدار ضرور ہوگا۔ایک حدیث میں ہے کہ جنتی جب جنت میں چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کہے گا' تم اور کچھ زیادہ چاہتے ہو؟ تو جنتی کہیں گے کہ اے اللہ! کیا تونے ہمارے منہ سفید (پرنور) نہ کئے۔ہم کو جنت نہ دی۔جہنم سے نہ بچایا۔(اب ہم اور کیا مانگیں) پھر پردہ اٹھ جائے گا۔اس وقت جنتیوں کو اپنے رب کے دیدار سے زیادہ کوئی چیز بھلی معلوم نہ ہوگی۔(مسلم)

صحابہؓ نے جب سوال کیا کہ کیا قیامت کے دن ہم اپنے رب کو دیکھیں گے تو نبی ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو فرمایا کہ جس طرح چودھویں رات کے چاند کو دیکھنے میں تمہیں کوئی دقت نہیں ہوتی (تم سب بیک وقت دیکھ سکتے ہو) اسی طرح تم (قیامت کے دن) اللہ کا دیدار کروگے اور تمہیں کوئی دقت پیش نہ آئے گی۔(بخاری ومسلم)

دنیا میں اللہ کو نہ دیکھ سکنا اور آخرت میں جنتیوں کا اللہ کو دیکھنا' ان دونوں چیزوں پر ہمارا ایمان ہونا چاہئے کیونکہ یہ دونوں عقائد قرآن وحدیث سے ثابت ہیں۔اس سلسلے میں ہم یہ قیاس نہیں کرسکتے کہ اگر آخرت میں اللہ کو انسان دیکھ سکتا ہے تو دنیا میں کیوں نہیں دیکھ سکتا کیونکہ عقیدہ میں قیاس نہیں چلتا۔ بلکہ عقیدہ وایمان میں جو چیزیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جس طریقے سے بیان فرمادیں' ان پر اسی طرح ایمان لانا پڑے گا۔اس میں ہم اپنی طرف سے کوئی عقلی قیاس' کوئی تبدیلی یا کمی بیشی کے مجاز نہیں۔اسی طرح ہم حدیث جبریل میں اللہ کو دیکھنے سے مراد بھی یہ نہیں لیں گے کہ ہم اپنی آنکھوں سے دنیا میں واقعی اللہ کو دیکھ سکتے ہیں۔کیونکہ اس بات کی دیگر آیات واحادیث سے صراحت کے ساتھ نفی ہوتی ہے اور خود اس حدیث کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ صرف ایسا سمجھنے کی حد تک ہے تاکہ عبادت میں یہ یقین بڑھ جائے کہ ہم اللہ کی نگرانی میں ہیں۔اس سے نماز اور دیگر عبادات میں ہمارا خشوع وخضوع بڑھانا مقصود ہے۔اس کے علاوہ ان الفاظ سے دیگر مطالب اور فلسفے نکالنا سراسر گمراہی میں پڑنا ہے اور یہ سلف صالحین کی مجموعی روش کے بھی خلاف ہے۔

عقیدہ و منہج

لیکچرز: پروفیسر حافظ محمد سعید حفظہ اللہ

قسط نمبر 6

توحید کی اقسام اور اس کے فوائد

گزشتہ اسباق میں ہم نے یہ آ گاہی حاصل کی کہ اللہ کے بندوں پر کیا حقوق ہیں' عبادت کسے کہتے ہیں اور اس ضمن میں عبادت میں داخل شرعی اور غیر شرعی طریقوں پر ایک تفصیلی بحث آپ نے ملاحظہ کی۔ اب ہمارا اگلا موضوع توحید کی اقسام اور اس کے فوائد سے متعلق ہے اور اس سلسلے میں چند اہم سوالوں کے جواب پیش خدمت ہوں گے۔ ان شاء اللہ

رسولوں کی بعثت کا مقصد

پہلا اہم سوال یہ ہے کہ

لماذا ارسل اللہ الرسل

اللہ تعالی نے رسولوں کو کیوں مبعوث کیا؟

اس کا جواب ہے۔

ارسلھم للدعوۃ الی عبادتہ ونفی الشرک عنہ

اللہ نے رسولوں کو اس لئے بھیجا کہ وہ اس کی عبادت کی طرف لوگوں کو دعوت دیں اور شرک سے لوگوں کو باز رکھیں۔

اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ ہے۔

ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت

اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے اجتناب کرو۔ (النحل۔36)

اس ضمن میں نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث مبارکہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

الانبیاء اخوۃ ...... ودینھم واحد

تمام انبیاء آپس میں بھائی ہیں اور ان کا ایک ہی دین ہے۔ (متفق علیہ)

قرآن مجید کی مذکورہ آیت اور حدیث رسول ﷺ سے یہ معلوم ہوا کہ تمام انبیاء اور رسل علیہم السلام کی بعثت اور آمد کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو صرف ایک اللہ کی عبادت پر جمع کریں۔ انہیں توحید کی طرف لائیں۔ شرک سے ہٹائیں کیونکہ لوگ شرک کی طرف بھاگ بھاگ کر جاتے ہیں۔ شیطان کی کوشش یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی عبادت اور توحید سے ہٹا کر انہیں شرک کی طرف لے جائے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں انبیاء کا کام لوگوں کو توحید اور اللہ کی عبادت کی طرف لانا ہے۔ شیطان کو جب جنت سے نکالا گیا تو اس نے اللہ سے اجازت لی کہ وہ انسانوں کو گمراہ کر سکے۔ اللہ نے اسے اجازت دی کہ وہ جو کر سکتا ہے کر لے لیکن ساتھ ہی اللہ نے یہ بھی بتا دیا کہ وہ یاد رکھ لے کہ میرے مخلص بندے تیرے پیچھے نہیں چلیں گے۔ اب شیطان کی کوشش ہے کہ چونکہ انسان کی وجہ سے وہ جنت سے نکلنے پر مجبور ہوا' اس لئے وہ بھی انسانوں کو جنت میں داخل نہ ہونے دے گا بلکہ وہ سب کو ساتھ لے کر جہنم میں جائے گا۔ جہنم میں لے جانے کا سب سے بڑا اور یقینی راستہ شرک کا راستہ ہوتا ہے۔۔ اس لئے شیطان کی سب سے بڑی کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ لوگوں کو شرک کی طرف کھینچے کیونکہ شرک ایک ایسی چیز ہے کہ جب انسان اس کی طرف آ جاتا ہے تو پورے دین سے آسانی سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ نے بے شمار انبیاء اور رسل صرف اسی ایک مقصد کے لئے بھیجے کہ وہ لوگوں کو شیطان کے اس راستے سے

ہٹائیں جو جہنم کی طرف لے کر جاتا ہے اور انہیں اللہ کی عبادت اور توحید کے اس راستے کی طرف دعوت دیں جو جنت کی طرف لے کر جاتا ہے۔ آدم ں سے لے کر خاتم النبین محمد رسول اللہ ﷺ تک سب انبیاء کا یہی مشن تھا۔ اب آپ ﷺ کے بعد قیامت تک آپ ﷺ کی امت کے علماء اور صلحاء کی یہ ذمہ داری لگائی گئی کہ وہ اس مشن کو ادا کرتے رہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو یہی سمجھایا تھا کہ میں اللہ کا آخری نبی ہوں۔ اللہ کی آخری کتاب نازل ہو چکی۔ آج اللہ کا دین مکمل ہو چکا۔ میں نے وہ سارا دین تمہیں پہنچا دیا' سمجھا دیا اور عمل کر کے دکھا دیا۔ اب میرا کام مکمل ہو گیا ہے۔ اب میرے بعد تم اس ذمہ داری کو اٹھاؤ گے۔ آپ ﷺ کے الفاظ تھے۔

فلیبلغ الشاھد الغائب پس جو موجود ہے' جو حاضر ہے' وہ اس کو پہنچانے کا فریضہ ادا کرے جو یہاں موجود نہیں۔

گویا کہ نبی ﷺ نے اس دین اور توحید کی دعوت کو لوگوں تک پہنچانے کا مشن اپنی امت کو سونپ دیا۔ اب امت کے ذمے دعوت کا کام ہے۔

دعوت کیا ہے؟

دعوت سے کیا مراد ہے؟ دراصل دعوت کہتے ہی توحید کی دعوت کو ہیں۔ اللہ تعالی کی عبادت کی طرف بلانے کو ہی دعوت کہا جاتا ہے۔ اگر ہم اس سلسلے میں امام ابن تیمیہؒ کی کتب کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ چاہے معیشت کا ہی کوئی مسئلہ بیان کرنے لگیں تو اس کا آغاز اللہ کی توحید سے کرتے ہیں۔ وہ اس کو یوں بیان کرتے ہیں کہ جب اللہ کی توحید میں انسان کا عقیدہ خراب ہو جاتا ہے تو پھر شرک کے آنے کی وجہ سے قوموں کی معیشت بھی تباہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سیاست اور دیگر اجتماعی امور سے متعلق کوئی مسئلہ ہو یا انفرادی اخلاقیات و معاملات حتی کہ نکاح' طلاق سے متعلق کوئی مسئلہ ہو تو امام ابن تیمیہؒ اللہ کی توحید سے ہی اس مسئلے کا حل بیان کریں گے۔ وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ہر چیز کی بنیاد اللہ کی توحید ہے۔ اور ہر بگاڑ کی بنیاد شرک ہے۔ جتنا لوگوں کے اندر شرک آتا جاتا ہے' اتنا ہی بگاڑ آ جاتا ہے۔ اور اتنی ہی دنیا و آخرت میں انہیں تباہیاں اور بربادیاں نصیب ہوتی ہیں۔ آپ یہ دیکھیں کہ بہت سے انبیاء ایسے گزرے ہیں کہ جن سے مختلف معاشرتی مسائل اس قدر ذکر نہیں ہوئے' صرف اللہ کی توحید کا ذکر ان سے ملتا ہے کیونکہ توحید مکمل دین ہے اور یہی ہمارے لئے سمجھنے کی بات ہے

طاغوت کیا ہے؟

جیسا کہ ہم یہ آیت ذکر کر چکے ہیں' اللہ تعالی نے فرمایا:

ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت

اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے اجتناب کرو۔ (النحل۔36)

یہاں طاغوت سے مراد شیطان ہے اور یہ معروف شیطان ابلیس بھی ہے جو لوگوں کو اللہ کی عبادت سے ہٹانے کی باقاعدہ کوشش کرتا ہے۔ اللہ کے مقابلے میں اس نے اپنا ایک پورا نظام کھڑا کیا ہوا ہے۔ اس لئے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ نے طاغوت کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ ''طاغوت ہر وہ چیز ہے جو اللہ کے مقابلے میں ہو''۔

یعنی ہر وہ چیز جو اللہ کے مقابلے میں مانی جائے' جو اللہ کے مقابلے میں تسلیم کر لی جائے' اس کو ایک قوت اور ایک نظام کے طور پر اللہ کے مقابلے میں مان لیا جائے تو وہ طاغوت ہے۔ طاغوت انسان بھی ہو سکتے ہیں جو اللہ کے مقابلے میں خود ربّ بن جائیں۔ اللہ کے حکم کے مقابلے میں اپنا حکم تسلیم کرائیں۔ اپنی آمریت قائم کرائیں' اسی طرح اللہ کے نظام اور دین کے مقابلے میں انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے نظام بھی طاغوت ہوتے ہیں چاہے وہ جمہوری نظام ہوں' سیکولر نظام ہوں۔ سرمایہ دارانہ نظام ہوں یا سوشلسٹ اور کمیونسٹ نظام ہوں' جو بھی چیز' انسان یا نظام اللہ کے مقابلے میں آئے گا' وہ طاغوت کہلائے گا۔ اس لئے اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت

کی عبادت سے اجتناب کرو۔اسی طرح اللہ کے نبی ﷺ نے بھی یہی بات بتائی کہ ''تمام انبیاء بھائی بھائی ہیں اوران کا ایک ہی دین ہے''۔

ان دونوں آیت اور حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ تمام انبیاء کی دعوت ایک تھی اور وہ توحید کی دعوت تھی۔آپ قرآن کا مطالعہ کریں اللہ تعالی نے نوح ں سے لے کر محمد ﷺ تک تمام چیدہ چیدہ انبیاء کی دعوت پیش کی۔ان سب کی ایک ہی دعوت نظر آئے گی کہ وہ لوگوں کو اللہ کی توحید کی طرف بلاتے رہے۔اس لحاظ سے ان سب کا دین ایک تھا۔یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ دین میں شریعتیں تو بدلتی رہی ہیں۔شریعت کے احکام میں اللہ تعالی تبدیلیاں کرتے رہے ہیں۔پہلے احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام اللہ تعالی دیتے رہے ہیں۔لیکن دین کی بنیاد شریعت کے ایسے احکام پر نہیں تھی اور نہ ان احکام میں تبدیلیوں کی بنیاد پر تھی۔دین کی بنیاد اللہ کی توحید پر ہے جو کبھی نہیں بدلی۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

شهد الله انه لا اله الا هو والملئكة والوا العلم قائما بالقسط لا اله الا هو العزيز الحكيم ان الدين عند الله الاسلام

اللہ تعالیٰ' فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ عدل کے ساتھ دنیا کو قائم رکھنے والا ہے۔اس غالب اور حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔بے شک اللہ تعالی کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔(آل عمران 18-19)

یعنی اللہ تعالی خود گواہی دے رہے ہیں' لا الہ الا اللہ کی شہادت خود اللہ تعالی پیش کر رہے ہیں اور اللہ تعالی کے تمام فرشتے اور تمام اہل علم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔فرمایا' اسی کا نام دین ہے۔یہی اصل اسلام ہے کیونکہ توحید ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جب اس پر انسان کا ایمان پختہ ہو جائے تو پھر اللہ تعالی دیگر شرعی امور میں جو بھی احکام لوگوں کو بدل بدل کر دیتا ہے' ان کے لئے ان پر چلنا کوئی مشکل نہیں رہتا۔

دین میں توحید اور دیگر شرعی احکامات کی حیثیت اور تعلق

توحید کو دین کی اصل بنیاد ماننے کا یہ مطلب نہیں کہ بس صرف توحید پر ایمان لایا جائے اور دیگر شرعی احکام پر عمل کرنا ضروری نہیں۔توحید کو اس لئے بنیاد قرار دیا گیا ہے کہ اس پر ایمان لانے سے ہی انسان کے لئے باقی شرعی احکام پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔توحید ان احکام پر عمل کرنے کے لئے راہ ہموار کرتی ہے۔اگر کوئی توحید کو تو ماننے کا دعویٰ کرے لیکن دیگر کسی شرعی حکم یا حلال حرام' نکاح' طلاق وغیرہ کے مسائل میں شریعت کی پاسداری کرنے کی ضرورت نہ سمجھے تو اسے اپنی توحید پر غور کرنا چاہئے۔توحید تو انسان کو اللہ کی پوری شریعت پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار کرتی ہے۔اگر انسان شریعت کو پوری طرح نہیں مان رہا تو یقیناً اس کی توحید میں ہی کوئی نقص ہے۔اللہ تعالی نے مختلف شریعتوں میں جو احکام بدل بدل کر دیئے' بعض شریعتوں میں جو حلال ہوتا' وہ دوسری شریعتوں میں حرام کر دیا جاتا' اسی طرح دیگر کئی اہم تبدیلیاں کی جاتی رہیں تو یہ کام لوگوں کے اس عقیدہ توحید کی آزمائش کے لئے کیا جاتا۔ جن کا اللہ پر ایمان پختہ ہوتا' عقیدہ توحید مضبوط ہوتا' وہ ان احکام میں تبدیلیوں پر بھی فوراً ایمان لاتے اور اسے اللہ کی حکمت اور مشیت سمجھتے اور جن کا عقیدہ توحید پر ایمان نہ ہوتا یا کمزور ہوتا تو وہ اعتراض کر بیٹھتے۔اور یوں وہ اس آزمائش میں ناکام ہو جاتے۔

توحید ربوبیت

توحید کی عام طور پر تین قسمیں کی جاتی ہیں۔

1۔توحید ربوبیت۔ 2۔توحید الوہیت۔3۔توحید الاسماء والصفات

اس سے پہلے کہ ہم توحید الرب یا توحید ربوبیت پر بحث کریں' اس بات کو ہم اچھی طرح سمجھ لیں کہ توحید ربوبیت اور توحید الوہیت میں کیا فرق ہے۔ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ توحید ربوبیت میں افعال اللہ تعالی کے ہوتے ہیں جبکہ توحید الوہیت میں افعال بندے کے ہوتے ہیں۔

توحید ربوبیت یہ ہے کہ اللہ کو اس کے تمام افعال میں ایک مانا جائے اور توحید الوہیت یہ ہے کہ بندے کے تمام افعال کو اللہ کے لئے خالص کر دیا جائے۔

اب ہم پہلے توحیدربوبیت کی وضاحت کریں گے

جب ہم کہتے ہیں کہ توحیدربوبیت میں افعال اللہ تعالی کے ہوتے ہیں اور اللہ کواس کے تمام افعال میں ایک ماننے کا نام توحیدربوبیت ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی کے تمام افعال میں کسی دوسرے کوشریک نہ مانا جائے۔اسے اپنے افعال میں ایک' یکتا اور لاشریک مانا جائے۔مثلا اللہ تعالی ہر چیز کودیکھتا ہے اور سنتا ہے' اللہ تعالی پیدا کرتا ہے' پرورش کرتا ہے تو اللہ تعالی کے ایسے تمام افعال میں ضروری ہے کہ کسی دوسرے کوشریک نہ کیا جائے۔توحیدربوبیت یا اللہ تعالی کے افعال دو چیزوں میں کارفرما ہوتے ہیں۔ایک اللہ کی تخلیق میں اور دوسرے تدبیر میں۔یعنی یہ ایمان رکھنا کہ یہ جس قدر کائنات ہے' سورج' چاند' تارے' زمین' آسمان اور ان میں موجود ہر چیز اللہ تعالی کی تخلیق ہے۔اسی طرح یہ ایمان رکھنا بھی ضروری ہے کہ کائنات کا سارا نظام چلانے والا اور اس کی تدبیر کرنے والا بھی اللہ تعالی ہے۔یہ سورج چاند کا اپنے مدار پر چلنا' دن رات کا آنا جانا' موسموں کا ہیر پھیر' بارش کا ہونا۔غرض ایک ذرے میں ایٹم کے چھوٹے سے چھوٹے نظام سے لے کر پوری کائنات کے نظام کو چلانے والا اور اس کی خاص تدبیر کرنے والا صرف اور صرف اللہ تعالی کو ماننا توحیدربوبیت میں شامل ہے۔

اللہ تعالی نے قرآن مجید میں ارشادفرمایا:۔

الحمد لله رب العالمين

تمام تعریف اللہ ہی کے لئے جو تمام جہانوں کا رب ہے

اور نبی ﷺ نے فرمایا

انت رب السموات والارض

توہی آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔(متفق علیہ)

مذکورہ بالا آیت وحدیث دونوں میں اللہ کیلئے رب کا لفظ استعمال ہوا ہے۔رب ایسا جامع لفظ ہے جس میں پیدا کرنے اور تخلیق کرنے کا معنی بھی پایا جاتا ہے' پرورش کا معنی بھی پایا جاتا ہے اور نظام چلانے کا معنی بھی اس میں شامل ہے۔''ربّ'' اللہ تعالی کی ایک جامع صفت ہے۔اس لئے علمائے عقیدہ توحیدربوبیت میں تخلیق کو تدبیر کے ساتھ اکٹھا بیان کرتے ہیں۔اس کی وجہ یہی ہے کہ عقیدے میں ہمیشہ یہ بہت بڑا بگاڑ رہا ہے کہ لوگوں نے عام طور پر اس بات کو تو ہمیشہ تسلیم کیا ہے کہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز اللہ کی تخلیق اور اللہ ہی کی پیدا کردہ ہے۔تخلیق کو تو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ ہی نے ساری کائنات اور سارا نظام پیدا کیا ہے لیکن اس نظام کی تدبیر اور اس نظام کار کو چلانے کا معاملہ وہ غیر اللہ میں تقسیم کردیتے ہیں۔جیسا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ جب کافروں کو یہ کہا جائے۔

ولئن سالتهم من خلق السموت والارض ليقولن الله

اوراگرآپ ان سے پوچھیں کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کئے تو وہ فوراً کہہ دیں گے کہ اللہ نے۔(الزمر۔38)

تو گویا تخلیق میں لوگ اللہ کا انکار نہیں کرتے۔لوگوں کو عموما بہت زیادہ غلط فہمی تدبیر کے معاملے میں رہی ہے۔

کائنات کی تدبیر کے معاملے میں ایک گمراہ کن فلسفہ یہ گھڑا گیا کہ اللہ نے یہ نظام کائنات ایک دفعہ بنادیا۔اب یہ سارا سسٹم خود بخود چل رہا ہے۔جب قیامت آئے گی تو اللہ اس کو سٹاپ کردے گا۔اس چلتے ہوئے نظام کو ختم کردے گا اور اس کا نام قیامت ہوگا۔ان فلسفیوں کے نزدیک پیدائش سے لے کر قیامت تک یہ سب نظام خود بخود چل رہا ہے اور تخلیق کے بعد اب اللہ کی تدبیر کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ایسے گمراہ کن فلسفوں کی وجہ سے ہی علمائے عقیدہ' توحیدربوبیت میں تخلیق کے ساتھ تدبیر کو بھی اکٹھا بیان کرتے ہیں تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ جس طرح شروع میں اللہ نے

پیدا کیا تو اس کے بعد بھی قیامت تک جو کچھ پیدا ہوتا رہے گا' ان سب کا پیدا کرنے والا بھی اور ان کی شکل وصورت' رنگ' ماہیت اور صفات کا پیدا کرنے والا بھی اللہ ہے۔ یہ سب کچھ محض خود بخود نہیں ہو رہا۔ کوئی بھی کام اللہ کی مشیت اور اختیار کے بغیر نہیں ہو رہا۔ قرآن مجید میں اللہ نے واضح طور پر اعلان کر دیا۔

☆ وما تسقط من ورقة الا يعلمها

کوئی پتہ بھی گرے تو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔ (الانعام۔59)

یعنی کائنات میں ہر آن جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں' کوئی بھی حرکت ہوتی ہے حتیٰ کہ ایک پتہ بھی گرتا ہے تو اللہ کے حکم اور اس کے اختیار اور اس کی تدبیر سے گرتا ہے' یہ سب کچھ خود بخود نہیں ہوتا۔ نظام کائنات کی تدبیر کے معاملے میں دوسرا گمراہ کن نظریہ یہ اختیار کیا گیا کہ اللہ نے ایک بار یہ ساری کائنات اور سارا طے شدہ نظام بنا دیا۔ اس کے بعد اب جو بھی اس میں ہمہ وقت اور ہر آن تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں تو یہ تبدیلیاں اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ اب اس نظام میں تبدیلیوں اور تصرف کا اختیار اللہ نے دوسروں کو سونپ دیا ہے۔ تصرف کی کچھ قوتیں فرشتوں کو دے دی ہیں کہ فلاں فرشتہ جب چاہتا ہے' بارش برساتا ہے اور فلاں فرشتہ فلاں تصرف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اسی طرح بعض تصرفات اور امور کائنات کا کچھ انتظام وانصرام کرنے کا اختیار اللہ نے اپنے بعض منتخب اور محبوب بندوں کو دے رکھا ہے۔ صوفیاء میں اس بنیاد پر مختلف اولیاء کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ جس کو تصرف کا جتنا زیادہ اختیار ہوتا ہے' اسے اتنا ہی بلند درجہ اور لقب دیا جاتا ہے۔ غوث' قطب اور ابدال کو ان کے ہاں بڑے درجات ہیں اور ان کے عقیدہ کے مطابق یہ غوث' قطب اور ابدال ہی ساری کائنات کا نظام چلا رہے ہیں اور وہ ان میں جو چاہتے ہیں تصرف کرتے ہیں اور تبدیلیاں لاتے ہیں۔

گویا یہ تو مانا گیا کہ کائنات کا نظام اللہ نے پیدا کیا اور یہ خود بخود بھی نہیں چل رہا لیکن اس کائنات کو چلانے اور اس کی تدبیر کرنے کے اختیارات اللہ کی بجائے دوسروں کو سونپ دیئے گئے۔ یہ عقیدہ سراسر ہندوؤں اور مشرکوں سے لیا گیا ہے۔ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ پوری کائنات کو بنانے والا' اس کو پیدا کرنے والا اور اس کی تخلیق کرنے والا ایک ہی ہے۔ وہ کائنات کے اس خالق کو رام کا نام دیتے ہیں جو ان کا سب سے بڑا دیوتا ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق رام نے یہ ساری کائنات' زمین' آسمان' سورج' چاند' ستارے' شجر' حجر غرض سب کچھ اس نے پیدا کیا اور ایک دفعہ پیدا کرنے کے بعد اب اس کا کام مکمل ہو گیا اور وہ آرام سے ایک طرف بیٹھا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بارش' کھیتی باڑی' اولاد کی پیدائش' خوش بختی' نحوست اور دولت وغیرہ کے لئے الگ الگ دیویوں اور دیوتاؤں کا ایک لامتناہی سلسلہ کھڑا کر دیا۔ اور اب جس کو جس قسم کی جو غرض ہوتی ہے' وہ اس قسم کی دیوی یا دیوتا کو اپنی حاجت برآری کے لئے پکارتا ہے اور اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ جب تک فلاں غرض کے لئے فلاں دیوی یا دیوتا کو نہ پکارا جائے گا' اس کا کام نہیں ہوگا۔ یہی ملتی جلتی تقسیم افسوسناک طور پر ہمارے ہاں صوفیاء نے کی ہوئی ہے۔ کسی ولی اور بزرگ کو اولاد کے حصول کے لئے مخصوص کیا ہوا ہے' کسی کو دولت اور کاروبار میں ترقی کے لئے' کسی کو بیماریوں میں شفاء کے لئے اور کسی کو کسی اور غرض کے لئے مخصوص کیا ہوا ہے اور اپنے ہر کام کے لئے ان بزرگوں کے مزاروں اور خانقاہوں کے الگ الگ طویل سفر کئے جاتے ہیں۔ وہاں غیر اللہ کے نام پر نذریں نیازیں' چڑھاوے او رہر وہ کام کیا جاتا ہے جو شرک وبدعت کے زمرے میں آتا ہے۔ کہنے کو ہم مسلمان کہلاتے ہیں لیکن سب مذہبی فلسفے ہندوؤں کے اپنائے ہوئے ہیں۔ عبادت کا شرکیہ رنگ ڈھنگ انہی کا اپنایا ہوا ہے۔ صرف اصطلاحات اور افعال کے نام اور چہرے بدلے ہوئے ہیں۔ جو حیثیت ہندوؤں میں ان کے دیوی دیوتاؤں اور بتوں کو حاصل ہے' وہی حیثیت ہم نے اپنے ولیوں' پیروں اور ان کی قبروں کو دے دی ہے۔ اپنے بزرگوں سے سنی سنائی اور معاشرے میں چلی ہوئی رسموں کو اہمیت دیتے ہیں لیکن خود قرآن وحدیث کھول کر اسلام کو سمجھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے اور نہ ان کے پیر اور مولوی اپنے عوام کو ایسا کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح ان کی گدیاں اور ان کا خانقاہی کاروبار سب کچھ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ بہرحال اب

یہ بات ہمیں سمجھ آ گئی ہوگی کہ معاشرے میں اصل اسلام سے دوری کی یہ صورتحال صرف اسلئے پیدا ہوئی کہ ہم نے بھی ہندوؤں کے فلسفوں کے زیراثر اللہ کو اس کائنات اور اس کے نظام کا خالق تو مان لیا لیکن اس کو مستقل چلانے والا اور اس کی تدبیر کرنے والا نہ مانا۔ اس نظام کو چلانے کے اختیارات غیر اللہ کو سونپ دیئے۔ جبکہ ہمارا یہ ایمان اور پختہ عقیدہ ہونا چاہئے کہ ساری کائنات کو پیدا بھی اللہ نے کیا ہے اور اسے چلا بھی وہی رہا ہے۔ نہ کسی کو پیدا کرنے میں اللہ کا کوئی شریک ہے اور نہ اس نظام کائنات کو چلانے میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ ہی اللہ نے یہ نظام چلانے یا اس میں تصرف کرنے کا اختیار کسی کو دیا ہے چاہے وہ کتنا ہی بڑے سے بڑا ولی' نبی اور پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔

دو شبہات کا ازالہ

اللہ اور بندے کے اختیار میں فرق

☆ ایک شبہ پیدا کیا جاتا ہے کہ اللہ نے انسان کو بھی دنیا میں کچھ اختیار دیا ہے۔ اس لحاظ سے انسان بھی کچھ نہ کچھ اختیارات کا مالک ہے...... تو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ دنیا میں انسان کے اس اختیار کی نوعیت آزمائش کی ہے۔ اور اس کا پھر قیامت کے دن حساب بھی ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ میں نے دنیا میں تمہیں جو اختیار دیا تھا تو کیا تم نے اس کو استعمال کرتے ہوئے میرا راستہ اختیار کیا تھا یا شیطان کا۔ اگر اللہ کا راستہ اختیار کیا ہوگا تو جنت کا حقدار بنے گا اور اگر شیطان کی راہ پر چلا ہوگا تو جہنم کے شدید ترین عذاب کا مستحق ہوگا۔ یہ اختیار وہ نہیں ہے جو اللہ کی تخلیق یا اس کے نظام کائنات میں تصرف کرنے والا یا اس میں شریک ہونے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے اس کی ہر چیز ذاتی ہے۔ اس کی ذات میں' صفات میں' اختیارات میں اور افعال میں کوئی شریک نہیں۔

☆ ہمارے ہاں عام طور پر بزرگوں' پیروں' ولیوں کے متعلق یہ عقیدہ بھی رکھا جاتا ہے کہ یہ جو ہماری مشکلیں حل کرتے ہیں' ہمیں بیٹے دیتے ہیں' رزق یا کاروبار وغیرہ میں ترقی دیتے ہیں تو یہ اپنے ذاتی اختیار سے نہیں دیتے بلکہ اللہ نے انہیں اختیار دیا ہوا ہے۔ اور کبھی کہتے ہیں کہ ہم انہیں خدا تو نہیں کہتے لیکن یہ ہمارے لئے اللہ کے ہاں وسیلہ اور سفارشی ہیں۔ اب اگر ہم قرآن کھول کر دیکھیں تو ساری حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہی عقائد تو مشرکین مکہ کے بھی تھے۔ اللہ کو تو وہ بھی خالق اور رب مانتے تھے لیکن پھر بہت سے کاموں کی تدبیر کے اختیارات انہوں نے اپنے مختلف بتوں کو دیئے ہوئے تھے۔ یہ بت بھی ان کے پرانے نیک بزرگوں کے ہی مجسمے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے یہ بزرگ اور بت اللہ کے بڑے مقرب اور بڑے وسائل رکھنے والے ہیں۔ اللہ ان کی ٹال نہیں سکتا۔ وہ ہماری بھی رسائی کرا دیں گے۔ ذرا قرآن کی یہ آیت ملاحظہ کیجئے۔

والذین اتخذوا من دونه اولیاء مانعبدهم الا لیقربونا الی الله زلفی

وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے۔ (وہ اپنے اس فعل کی توجیہہ یہ کرتے ہیں کہ) ہم تو ان کی عبادت صرف اسلئے کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ تک وہ ہماری رسائی کرا دیں۔ (زمر۔3)

قرآن کی ایسی آیات اور احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کی تخلیق اور اس کی تدبیر میں کوئی شریک نہیں۔ کوئی بڑے سے بڑا ولی' نبی اور پیغمبر بھی اللہ کی تخلیق اور اس کی تدبیر یا اختیارات میں تصرف نہیں کرسکتا۔ سب اختیارات اللہ کے پاس ہیں اور یہی توحید ربوبیت ہے۔ اللہ تعالیٰ سمجھنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

توحید الحکم (حاکمیت میں توحید)

عام طور پر علماء نے حاکمیت میں توحید کے مسئلہ کو توحید الوہیت یعنی توحیدِ عبادت کا حصہ قرار دیا ہے اور اسے الگ طور پر بیان نہیں کیا۔ لیکن بہت سے علماء وہ بھی ہیں جو حکم (حاکمیت) کے مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر اسے الگ طور پر بیان کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکم کا مسئلہ عبادت کا اہم ترین جز ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جس کو حکم کا حق دے گا' اس کے سامنے ہی جھکے گا اور اطاعت کرے گا۔ اسلام میں حکم کا حق صرف رب العالمین کا ہے۔ اللہ کے سوا کسی فرد 'جماعت' طبقہ یا مجموعی طور پر پوری امت کو بھی حکم کا حق حاصل نہیں ہے۔ اصولی طور پر اللہ کے سوا جس کو بھی حکم کا حق دیا جائے گا' اسے اللہ کا شریک بنایا جائے گا۔ تمام انسان اللہ کے بندے ہیں۔ سب اسی کا حکم ماننے کے پابند ہیں۔ اللہ کا حق ہے کہ وہ بندوں کو حکم دے اور بندوں کا فرض ہے کہ سب اس کی اطاعت کریں۔ اسی سے ہر قسم کا عدل قائم ہوتا ہے اور ظلم کے دروازے بند ہوتے ہیں۔

حکم دو قسم کا ہے! **حکم تکوینی اور حکم تشریعی :**

حکم تکوینی......یعنی حکم قدری یہ ہے کہ جس میں انسان کے ارادے کا کوئی دخل نہیں۔ مثلاً بیماری آ جانا' پیدائش وغیرہ۔ انسان چاہے یا نہ چاہے' بہت سے امور اس کے اختیار یا ارادے کے بغیر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ مسلمان کا اس پر ایمان ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ نفع ونقصان' صحت وبیماری اور موت وحیات' اس میں بندے کے اختیار کا دخل نہیں ہوتا۔

حکم تشریعی......وہ ہے جس کی اطاعت کے لئے اللہ نے شریعتیں نازل کی ہیں۔ انبیاء ورسل اور کتب کے ذریعے حلال وحرام اور امر ونواہی اور معاشرتی زندگی گزارنے کے لئے ہدایات' آداب' اَخلاق مقرر کئے ہیں اور عبادات ومعاملات متعیّن فرمائے ہیں۔ مسلمانوں کو پابند کیا جاتا ہے کہ وہ احکام الٰہی کو اپنی زندگیوں اور معاشروں میں قائم کریں۔ ان پر عمل کریں۔ ان کی دعوت دیں اور ان کے غلبہ کے لئے جہاد کریں۔

یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ شریعت کے احکام بنانے کا اختیار انسانوں کو حاصل نہیں ہوتا۔ صرف انہیں نافذ کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔ اسی اختیار میں بندوں کا امتحان ہے کہ وہ انسانی ضابطوں' قوانین اور ڈھانچوں کو پسند کرتے ہیں اور ان کو نافذ کرتے ہیں یا اللہ کا حکم قائم کر کے اپنے آپ کو اللہ کا تابع بنا لیتے ہیں۔

جہاں تک تکوینی یا قدری حکم کا تعلق ہے' وہ خود بخود نافذ ہوتا ہے۔ اس میں بندوں کا امتحان نہیں ہے کیونکہ بندوں کا اس میں اختیار نہیں ہے۔ یہ سوال نہیں ہوگا کہ تم پیدا کیوں ہوئے تھے یا مرے کیوں تھے یا فلاں وقت تمہیں گھاٹا کیوں پڑ گیا تھا۔ ان امور کو مسلم اور غیر مسلم سب ہی اللہ کی طرف سے جانتے ہیں۔ پہلے مشرکین بھی مانتے تھے اور آج کے مشرکین بھی اختلاف نہیں کرتے۔ اصل مسئلہ حکم تشریعی کا ہے۔ انبیاء اور کتب کا بڑا موضوع بھی حکم تشریعی ہی ہے۔

حکم تکوینی اور حکم تشریعی کی وضاحت کے لئے سورۂ یوسف کی مثالوں پر غور کیجئے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام جب جیل میں بند کر دیئے گئے تو دو شخص اور بھی ان کے ساتھ قید میں تھے۔ یوسف علیہ السلام بحیثیت نبی اپنا دعوتی فریضہ ادا کرتے ہوئے اپنے قید کے ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ط اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّاتَعْبُدُوْٓا اِلَّآاِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَايَعْلَمُوْنَ ۝

''اے میرے قید کے ساتھیو! بہت سے رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو بہت قوت والا ہے۔ تم تو اللہ کو چھوڑ کر کچھ ناموں کو پوجتے ہو۔ جو نام تم نے خود رکھ لئے ہیں یا تمہارے باپ دادا نے' کچھ نام ان کو دے دیئے جبکہ اللہ نے اس کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ حکم تو صرف اللہ کا ہے۔ اسی کا فرمان ہے کہ تم صرف اسی کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا دین ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' (سورۂ یوسف ۳۹۔۴۰)

آیات مبارکہ میں یوسف علیہ السلام دعوت توحید پیش کرتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ حقیقت میں حکومت صرف اللہ کی ہے' اسی کا حکم بھی چلنا چاہئے۔لیکن عجیب بات ہے کہ لوگ اللہ کے سوا غیروں کی عبادت کرتے ہیں حالانکہ اللہ نے صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے۔لوگوں نے سب سے بڑے اور سب سے اہم مسئلہ کو نہیں سمجھا۔اللہ کو چھوڑ کر بہت سے معبود بنالئے۔خود ہی ان کے نام رکھ لئے اور خود ان کو اختیارات سونپ دیئے اور ان کے بارے میں گمان کرلیا ہے کہ یہ خدا فلاں فلاں نام سے فلاں فلاں کام کرتے ہیں۔جبکہ اللہ نے اپنے اختیارات کسی کو نہیں سونپے اور نہ کسی کو ان کاموں پر مامور کیا۔لوگ سب کچھ اپنی طرف سے کرتے ہیں۔اللہ کا حکم چھوڑ کر اپنی پسند اختیار کرتے ہیں۔یہ حکم تشریعی کی مثال ہے۔

حکم تکوینی کی مثال بھی سورہ یوسف میں ہے۔یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی کہ تم اکٹھے ایک ہی دروازے سے شہر میں داخل نہ ہونا۔ ہوسکتا ہے تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔تمہارے پیچھے کوئی لگ جائے یا تمہیں نظر لگ جائے۔یہ خوبصورت اور جوان تھے۔باپ نے خطرے کے پیش نظر نصیحت کی۔لیکن ساتھ ہی کہا کہ اصل حکم تو اللہ کا چلتا ہے۔اگر اس کی طرف سے کوئی نقصان ہونا ہوا تو کوئی نہیں بچا سکتا۔میں اللہ پر توکل رکھتا ہوں اور سب کو اسی پر توکل کرنا چاہئے۔گویا وہ اس عقیدے کا اظہار کر رہے ہیں کہ اگر اللہ کو کوئی نقصان منظور ہے تو میں اس کے ردّ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔البتہ خطرے سے بچنے کیلئے انسان تدبیر کرسکتا ہے۔تدبیر اس لئے ضروری ہے کہ انسان کو علم نہیں ہوتا کہ اللہ کا فیصلہ کیا ہوگا۔توکل کا یہ مطلب نہیں کہ دنیاوی وسائل کے استعمال کو غلط سمجھا جائے۔نبی ﷺ نے فرمایا کہ اونٹ کا گھٹنا باندھو پھر اسے اللہ کے سپرد کرو۔(ترمذی)

دونوں مثالوں میں حکم کی دونوں شکلیں واضح ہوجاتی ہیں۔پہلی مثال میں حکم تشریعی کو واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی عبادت کا حکم دیا ہے اور کسی کو عبادت کے لائق نہیں بنایا۔لیکن انسان خود ہی غیروں کو عبادت کے لئے مقرر کرلیتے ہیں۔عبادت اور اطاعت کا اپنا نظام قائم کرکے اس کی اطاعت شروع کردیتے ہیں۔اللہ نے بندوں کو حکم تسلیم کرنے کا جو اختیار دیا ہے۔اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

دوسری مثال میں حکم تکوینی کی وضاحت ہے جس میں یعقوب علیہ السلام نصیحت کے ساتھ اپنے عقیدے کا اظہار کرتے ہیں کہ اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو اس کے ہٹانے میں کسی کا کوئی اختیار نہیں۔صرف اللہ ہی کا حکم چلتا ہے۔

زیادہ وضاحت طلب معاملہ حکم تشریعی کا ہے جو حاکمیت کی اصل بحث ہے۔

حاکمیت سے مراد یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ یعنی فرمانروائی کا حق کسے دیا جاتا ہے۔Sovereign یعنی مقتدر اعلیٰ کون ہے۔یہ مسئلہ ہمیشہ ادیان ونظریات میں زیر بحث رہا۔اللہ کی نازل کردہ شریعتوں اور انبیا ورسل نے ہمیشہ یہ وضاحت کی کہ حاکمیت یعنی فرمانروائی کا حق صرف رب العالمین کا ہے۔اس نے ساری کائنات پیدا کی ہے۔تمام مخلوق اسی کے حکم پر قائم ہے اور اسی کی فرمانبردار ہے۔اسی لئے زمین وآسمان اور سورج چاند ستاروں وغیرہ ہر چیز کا نظام صحیح چل رہا ہے۔اسی اللہ کا حکم انسانوں پر بھی چلنا چاہئے۔اگر کائنات میں دو رب مان لئے جائیں تو کبھی نظام نہیں چل سکتا۔فطرت بھی یہی تقاضا کرتی ہے۔اللہ کی شریعت دنیا میں جاری فطرت کے ساتھ پوری مطابقت رکھتی ہے۔اس لئے کہ جس نے فطرت بنائی' اسی نے شریعت بنائی۔اگر دونوں کا خالق الگ الگ مان لیا جائے تو بگاڑ کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور اسی کا بگاڑ دنیا میں ہمیشہ دیکھا گیا۔یہی ظلم عظیم ہے کہ اللہ کا حق دوسروں کو دے دیا گیا۔اس ظلم سے ہی دنیا میں ہر قسم کا ظلم پھیلتا ہے۔اس بڑے ظلم کے خاتمے کے لئے اللہ کے نبی' رسول اور کتابیں اور شریعتیں آئیں۔اللہ کے نبی اور شریعتیں انسانوں کو اللہ کی طرف بلاتی رہیں اور ظلم کا خاتمہ کرکے اصلاح کرتی رہیں۔کسی نبی نے صرف دعوت کے ساتھ لوگوں کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اللہ کا حکم پہنچایا اور کچھ نبی ایسے بھی تھے جنہیں دعوت کے ساتھ جہاد کی ذمہ داری بھی دی گئی کہ قوت تیار کرکے ظلم کے خلاف سینہ سپر ہوجاؤ اور دنیا سے ظلم مٹا کر اللہ کا حکم قائم کردو۔آخری نبی محمد ﷺ کو دعوت کے ساتھ جہاد کی فرضیت بھی سونپی گئی اور انہیں مامور کیا گیا کہ تمام ادیان پر اسلام کو غالب کردو۔چنانچہ نبی ﷺ نے خود دعوت کے ساتھ جہاد کیا اور اپنی امت کو اس کا پابند بنایا اور قیامت تک جہاد وقتال کو جاری رکھنے کا حکم دیا اور اس کا بنیادی مقصد یہ قرار دیا کہ اللہ کا حکم بلند ہو اور غیر اللہ کے کلمے سرنگوں ہوجائیں۔

فرعونوں کے بعد اللہ سے بغاوت کا نیا انداز فرد واحد اور اکثریت کی آمریت

قدیم دور میں زیادہ تر انحصار اس پر رہا ہے کہ بعض انسان اپنے آپ کو حاکم مطلق سمجھ لیتے یا لوگ ان کی کہی ہوئی بلکہ خواہش کی ہوئی ہر بات کو حکم کا درجہ

دیتے اوران کے سامنے جھک جاتے۔ایسے بہت سے فرعون انسانی تاریخ میں ملتے ہیں۔ان کے مقابلے میں اللہ کی ربوبیت، الوھیت اور حاکمیت کا اعلان کرنے والے اورفرعونوں سے اس مسئلے پرلڑنے والے اللہ کے بندے بھی ملتے ہیں۔لیکن آخری امت میں حاکمیت کا رنگ ذرا بدلا۔عام طور پرکسی نے اپنے کو رب بنا کرتو اپنا حکم منوانے کی کوشش نہیں کی۔البتہ غیر اسلامی مذاہب ونظریات سے فائدہ اٹھا کراورانہیں اسلام میں داخل کرکے حاکمیت کا رنگ بدل دیا۔بعض نے اپنے آپ کوظل الٰہی کےطور پر پیش کیا اورلوگوں نے بھی ان کو یہ حق دیا کہ ان کی ہرخواہش اللہ کا حکم ہے۔اس سے ظالم بادشاہ من مانی کرتے رہے۔مسلم معاشروں میں ظلم پھیلتا رہا۔پھر جدید دور میں چونکہ مغرب کوسیاسی اور معاشرتی تسلط حاصل تھا، اس لئے ان کا نظریۂ جمہوریت پھیلا اور مسلمان ملک اور معاشرے ان سے متاثر ہوئے۔خصوصاً اس لئے کہ بیشتر مسلمان علاقے بڑی دیر تک مغربی ملکوں برطانیہ وغیرہ کے زیرحکومت رہے۔اسی ذریعے سے یہ نظریہ پھیلا کہ حاکمیت یعنی اقتدار اعلیٰ کا حق ریاست کے تمام افراد کو مجموعی طور پر حاصل ہوتا ہے۔ان کی نمائندگی چونکہ پارلیمنٹ کرتی ہے جس کا انتخاب عوام کرتے ہیں تو حاکمیت کا حق عوامی نمائندوں کو حاصل ہوتا ہے۔ان کو حق ہوتا ہے کہ عام لوگوں کے فائدے کے لئے وہ جو چاہیں دستور اور قانون وضع کریں۔ان کی اکثریت سے حکومت بنتی ہے جو دستور وقانون کو نافذ کرتی ہے۔یہ پورا نظام عوام کی حاکمیت پر قائم ہوتا ہے۔یہی نظام تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ اکثر ملکوں میں نافذ ہے اور عالمی سطح پر اسے تسلیم کیا گیا ہے۔صرف اسلام نے اسے قبول نہیں کیا۔باقی سب مذاہب اور قوموں نے بعض تبدیلیوں کے ساتھ مانا ہوا ہے۔افسوسناک بات یہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں نے بھی اسے قبول کیا ہوا ہے۔وہ عالمی حالات کے مطابق چلنا چاہتے ہیں لیکن عالم کے رب اوراس کے دین کی پرواہ نہیں کرتے۔

حقیقت یہ ہے کہ حاکمیت یعنی اقتدار اعلیٰ کا حق اللہ کے سوا کسی کو سونپنا صریحاً کفر اور شرک ہے۔وہ بادشاہ ظالم تھے جن کا حق حاکمیت تسلیم کرکے ان کی غلامی کی گئی۔اسی طرح بعض طبقوں اور جماعتوں کو اقتدار اعلیٰ کا حق دے کر دنیا میں آمریت کے نظام قائم کئے گئے جیسا کہ بہت سے کمیونسٹ ملکوں میں آمریت چلتی رہی ہے۔آمریت بھی اسی طرح کا ظلم ہے اور ریاست کے عوام کو حق حاکمیت دینا اوران کے منتخب نمائندوں کے ذریعے اقتدار اعلیٰ کو ریاست میں قائم کرنا اوراس کے لئے دستور وقانون وضع کرنا بھی صریح ظلم ہے۔ کوئی فرد یا جماعت یا سب عوام اقتدار اعلیٰ کا حق نہیں رکھتے۔ان اصولوں پر بنے ہوئے سب نظام اللہ کے خلاف کھلی بغاوت ہیں۔ان کا اپنا کوئی حق حاکمیت نہیں ہے اور نہ ہی وہ اللہ کے حقِ حاکمیت میں شریک ہیں۔سب اللہ کے بندے ہیں۔کچھ اللہ کی بندگی کو مانتے ہیں جو مسلمان کہلاتے ہیں اور کچھ اللہ کی بندگی سے انکاری۔وہ مسلمان نہیں ہیں۔مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اللہ کا حکم قائم کریں۔

موجودہ دور میں پارلیمنٹ کے حق حاکمیت پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔بہت سے جدید علماء بھی جدید فکر سے متاثر ہوکر ایسی بات کہہ رہے ہیں۔اس سلسلہ میں اللہ کے قرآن کی رہنمائی ضروری ہے۔قرآن نے یہودیت اور عیسائیت کو ہدف تنقید بناتے ہوئے بتایا کہ یہود ونصاریٰ نے اپنے پیشواؤں کو رب مان کران کی اطاعت شروع کی ہوئی تھی۔سورہ التوبہ میں ہے۔

اِتَّخَذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًامِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ

"انہوں نے اپنے علما ومشائخ کو اللہ کے سوا رب بنالیا تھا۔"(التوبہ ۳۱)

آیت قرآنی میں احبار اور رھبان کے الفاظ ہیں۔احبار یہود کے بڑوں کو کہا جاتا تھا اور رہبان راہب کی جمع۔اس سے مراد نصرانیوں کے پیشوا ہیں۔انہیں رب کیوں کہا گیا۔اس کی وضاحت عدی بن حاتم والی روایت سے ہوتی ہے۔جسے ابن کثیر اور دیگر معتبر تفاسیر نے بیان کیا ہے۔

عدی بن حاتم جو پہلے نصرانی تھے، نے قرآن کے اس بیان کے بارے میں نبی ﷺ سے وضاحت پوچھی۔کہنے لگے کہ اسلام سے پہلے ہم نے کبھی احبار و رہبان کو رب نہیں بنایا تھا۔پھر قرآن نے ایسا کیوں کہا۔اس پر نبی ﷺ نے عدی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ کیا یہود ونصاریٰ ان پیشواؤں کو حق نہیں دیتے کہ وہ جو حکم دیں، اسے مان لیا جائے۔حلال وحرام کے بارے میں بھی حکم جاری کرنے کا انہیں اختیار کیا نہیں دے رکھا اور کیا ان کے حکم پر عمل نہیں کرتے۔تو عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے تصدیق کی کہ بالکل ایسا ہی ہے۔انہیں حکم کا اختیار حاصل ہے۔نبی ﷺ نے فرمایا، یہی ان کو رب بنانا ہے۔قرآن نے اسی معنیٰ میں ان کی ربوبیت کی بات کی ہے۔(ترمذی، مسند احمد)

قرآن نے وضاحت کی ہے کہ اللہ ہی الہ واحد ہے۔اسی کی عبادت ہے۔اللہ کے علاوہ کسی کو حاکمیت کا حق دینا اسے رب اور الٰہ ماننا ہے۔آج مسلم ملکوں

میں پارلیمنٹوں کو اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔ حکومتیں اور عوام ان کی پابندی کرتے ہیں۔ سورۂ یوسف میں اسے ہی دین بنانا کہا گیا ہے۔ سیدھا صاف دین یہ ہے کہ صرف اللہ کے حکم کی اطاعت ہو اور کسی کو حکم کے حق میں اللہ کا شریک نہ بنایا جائے۔

سورہ الشوریٰ میں فرمایا

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْ بِهِ اللّٰهُ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِىَ بَيْنَهُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ o

''کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کا حکم اللہ نے نہیں دیا۔ اگر فیصلے کے دن کا وعدہ نہ ہوتا تو ان میں فیصلہ کر دیا جاتا اور جو ظالم ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔'' (الشوریٰ۔ ۲۱)

سورہ شوریٰ میں تشریع لغیر اللہ کے بارے میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ جو لوگ اپنے طور پر بندوں کے لئے تحکیم شریعت کے اختیارات رکھتے ہیں، وہ اللہ کے شریک ہیں۔ دوسرے ایسے عقیدے رکھنے والے لوگوں کے بارے میں سخت وعید بیان فرمائی ہے۔

صحیح عقیدہ اور منہج یہ ہے کہ دین حکم اللہ کی اطاعت کا نام ہے۔ یہ حق نہ کسی فرد کو دیا جا سکتا ہے اور نہ مجموعی طور پر جماعت یا امت کو یہ حق حاصل ہے۔

اسلامی جمہوریت کا دھوکا

بڑا مغالطہ یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ارکان کی پارلیمنٹ بحیثیت مجموعی حاکمیت کا حق رکھتی ہے کیونکہ عام لوگوں نے ان کو اعتماد دیا ہوتا ہے۔ پھر چونکہ وہ مسلمان ہوتے ہیں اور ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ وہ تو اللہ کے حق کو بخوبی سمجھتے ہیں تو وہ اللہ کے شریک کیسے بن سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو یہ اختیار دیا ہی نہیں۔ چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ لیکن پارلیمنٹ کو آج یہ اختیارات حاصل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ عملاً مسلمان ملکوں میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کھلی اللہ کی بغاوت ہے۔ پارلیمنٹ میں جو چیز منظور ہو جاتی ہے وہ نافذ ہو جاتی ہے۔ آج اگر کوئی مسلمان جج قرآن کے واضح حکم پر فیصلہ کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا۔ وکلاء اسے فوراً ملکی قانون کا حوالہ دیں گے جسے پارلیمنٹ کا پورا تحفظ حاصل ہوگا۔ وہاں مسلمان جج مجبور ہو جائے گا۔ اسے قرآن کا حکم چھوڑ کر پارلیمنٹ کا منظور شدہ قانون ماننا پڑے گا۔ اگر کوئی شخص پاکستان میں کہے کہ میں بنک کے قرض پر سود ادا نہیں کروں گا کیونکہ یہ شریعت کے صریحاً خلاف ہے تو حکومت حرکت میں آئے گی اور اس کی جائداد ضبط کر لی جائے گی۔ اللہ کا حکم نہیں سنا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ باطل نظاموں کی تاویلیں کرنے کی بجائے ان کی ایسی حقیقی اور عملی شکل کو دیکھا جائے کہ کس طرح اللہ کے حکم کو رد کیا جاتا ہے اور اپنے حکم چلائے جاتے ہیں۔

اللہ کی حاکمیت اور نبی ﷺ اور امیر کی اطاعت کی حیثیت

اللہ کے حق حاکمیت کی وضاحت کے بعد سوال یہ سامنے آتا ہے کہ نبی اور حکومت کی کیا حیثیت ہے؟ اس کی وضاحت کے لئے پہلے یہ ایمان ضروری ہے کہ مصدر حاکمیت بلا شرکت غیرے اللہ رب العالمین ہے۔ لیکن نبی کی حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے مامور ہیں۔ وہ خود بخود نہیں بلکہ اللہ نے انہیں مطاع بنایا ہے یعنی ان کی اطاعت کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ والدین اور حکومت کی اطاعت بھی اللہ کے حکم سے ہے۔ مخلوق میں سے کسی کا حکم اللہ سے ٹکرا جائے تو اس کا حکم نہیں مانا جائے گا۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ نبی کی بات اور اللہ کے حکم میں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ بعض لوگ غلط عقیدے یا بدنیتی کی وجہ سے اللہ اور رسولؐ کے درمیان اختلاف ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور قرآن و حدیث میں اختلاف بیان کرتے ہیں۔ دراصل وہ حدیث کا انکار کرتے ہیں اور قرآن کی تشریحات اپنی مرضی سے کر کے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نبی ﷺ کو اللہ نے اطاعت کے اعتبار سے مقام دیا ہے۔ فرمایا

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ o

''جو چیز تمہیں نبی ﷺ دیں اسے لے لو اور جس سے منع کر دیں، اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ سخت پکڑنے والا ہے۔'' (الحشر ۷)

اسی طرح فرمایا۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ

''جو رسول کی اطاعت کرے گا بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ (النساء ۸۰)

لیکن نبی ﷺ کے بعد امراء یا آئمہ حکومت کی اطاعت کو اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ مشروط کر دیا گیا۔ گویا کہ کوئی حاکم اپنی اطاعت کا حکم نہیں دے سکتا بلکہ وہ خود بھی اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرے گا اور ماتحتوں کو بھی اللہ اور رسول ﷺ کا تابعدار بنائے گا۔ یہی اسلامی حکومت ہے۔ اگر حاکم خود غلطی کرلے تو دوسروں کو غلطی کا پابند نہیں بنائے گا بلکہ انہیں اللہ کی شریعت پر چلائے گا۔ حاکم کی غلطی امت کے لئے دلیل نہیں ہے۔ حاکم سے غلطی پر رعایا باز پرس کر سکتی ہے۔ اسے تنبیہہ کر سکتی ہے اور افراد امت کا فرض ہے کہ وہ حاکم کو نصیحت کریں۔ اسلام میں حاکم آمر مطلق نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ مشورہ کر کے فیصلہ کرلے۔ مشورہ لینے والوں اور مشورہ دینے والوں سب پر لازم ہے کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ کے حکم تک پہنچنے کی کوشش کریں اور سب کے پیش نظر امت کی فلاح ہونی چاہئے۔ کوئی ذاتی مقاصد نہیں ہونے چاہئیں۔ اس اعتبار سے اسلام میں حکم اور اس کے نفاذ کا اپنا ایک نظام ہے۔ وہ دوسرے تمام نظاموں سے قطعی مختلف ہے۔ اسے بادشاہت، آمریت یا جمہوریت میں سے کسی پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام اور جمہوریت متضاد ہیں

پہلوں نے اگر اسلام کے نام پر بادشاہتیں قائم کیں اور کرسیوں پر لڑائیاں کیں اور اپنی آمریتیں چلائیں تو جدیدیت کے حامیوں نے بڑی کوشش کے ساتھ اسلام کے نظام حکم کو جمہوریت سے ہم آہنگ کیا ہے بلکہ حقیقت ہے کہ مغربی طرز جمہوریت کی اصلاحات کو اسلامائز کرنے کی کوشش کی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوریت کی روح پروان چڑھی ہے۔ مسلم معاشرے اور ملک الحاد کی طرف بڑھے ہیں، وضعی دستور اور قانون کی اطاعتیں ہوئی ہیں۔ اللہ کا حکم بھی قائم نہیں ہوسکا۔ مسلم ملکوں میں اسلام پسند طبقے جمہوری حکومتوں سے مطالبے ہی کرتے رہ جاتے ہیں کہ اسلام کی حکمرانی قائم کی جائے۔ اس کے لئے فلاں دستوری ترمیم ضروری ہے۔ بڑے شور ڈالنے سے اسلام کی بعض شقوں کو اگر شامل کر لیا جاتا ہے تو یہ وہ شقیں ہوتی ہیں جو وضعی دستور اور قوانین کے بنیادی ڈھانچے کو نہیں بدلتیں۔ ان سے معاشی اور سیاسی تبدیلیاں رونما نہیں ہوسکتیں...... صرف دکھاوا ہوتا ہے۔ کہیں بھی اس طریقے سے اللہ کی حاکمیت اور اطاعت کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اگر کہیں اسلام پسند جماعتوں کی محنت سے دستور میں اللہ کو حاکم مطلق کہا گیا تو اسے دساتیر کے عملی طریق کار کے قوانین میں لا کر بے اثر کر دیا گیا۔ ان دستوروں کی موجودگی میں کبھی عدالتیں اللہ کی شریعت پر فیصلہ نہیں کر سکیں۔ ملکوں میں عوامی حاکمیت کا ایک نظام ہے جسے جمہوریت کہتے ہیں اور سیاسی طبقے ہمیشہ اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بعض مسلم ممالک میں اسی کا نام اسلامی جمہوریت رکھ دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جمہوریت متضاد ہیں۔ اسلام اللہ کی حاکمیت پر قائم ہوتا ہے اور جمہوریت عوام کی حاکمیت پر قائم ہوتی ہے۔ مسلم ممالک میں جہاں بھی جمہوریت آئی، اس نے اپنے گُل کھلائے۔ اس نے ہر جگہ مسلمانوں میں بگاڑ اور الحاد پیدا کئے۔ اس کی بنیاد ہی عوامی حاکمیت پر ہے۔ مسلمان نمائندے جہاں بھی منتخب ہو کر گئے، انہوں نے ہر جگہ اللہ کی حاکمیت کے مقابلے میں غیر اللہ کے نظام قائم کئے۔ مصر میں ایسا ہی ہوا اور پاکستان میں عرصہ دراز سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ مقنّنہ اور عدلیہ میں مسلمان ہی یہ سب کچھ کرتے رہے ہیں۔

موجودہ جمہوری نظام میں مجلس قانون ساز کو اس بنیاد پر منتخب کرنا کہ انہیں اختیار سونپا جائے کہ وہ بندوں کے حقوق کے ضمن میں قوانین وضع کریں، پھر اپنے بنائے ہوئے قوانین سے بندوں کے حقوق کا فیصلہ کریں۔ یہی اصولی طور پر غلط ہے۔ اللہ نے بندوں کے حقوق مقرر کر دیئے ہیں۔ اللہ کی نازل کردہ شریعت میں حقوق کا بیان اور ضابطے موجود ہیں۔ ان پر مزید قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو اللہ کے قانون پہ قانون بناتا ہے، وہ اللہ کا شریک بنتا ہے۔ کسی فرد یا ادارے کو اس کا حق حاصل نہیں۔

حکومت کا قانون بنانے اور اجتہاد کا دائرہ

ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا حکومت قانون بنا ہی نہیں سکتی یا بعض امور میں قانون بنا سکتی ہے اور اس کا دائرہ کیا ہوگا؟ اس کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ہم سمجھیں کہ شریعت میں دو قسم کے امور ہیں۔ کچھ امور وہ ہیں جنہیں اللہ نے شرح وبسط کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ وہ قرآن میں ہوں یا ان کی وضاحت احادیث رسول ﷺ میں ہو۔ نماز، روزہ اور دیگر ارکان عبادات کی ذیل میں ہیں اور معاملات میں نکاح، طلاق، وراثت کی تقسیم وغیرہ ہے۔ اسی طرح حدود جو

جرائم پر لاگو ہوتی ہیں (فوجداری قوانین وغیرہ) وہ چیزیں ہیں جو شریعت میں مقرر کر دی گئی ہیں' ان میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ان پر اجتہاد کرنا یا حالات کی مطابقت سے ان میں ترمیم کرنا کسی شکل میں بھی ممکن نہیں ہے۔ان کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کرنا اور ان پر عمل کرنا فرض ہے۔کچھ چیزیں ہر فرد کو ذاتی طور پر پابند کرتی ہیں۔کچھ چیزیں اجتماعی ہیں۔وہ حکومت کے دائرے میں آتی ہیں۔ان کا قائم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔لیکن کوئی حکومت یا پارلیمنٹ ان کے بارے میں قانون سازی نہیں کرسکتی۔سب اللہ کے حکم کی پابندی کریں گے۔اگر کوئی حاکم یا پارلیمنٹ اللہ کے حکم پر قانون سازی کریں اور اللہ کے حکم پر فیصلے نہ کریں تو وہ اللہ کی بغاوت کے مرتکب ہوتے ہیں۔اسی کو قرآن نے کفر' ظلم اور فسق قرار دیا ہے اور ایسے لوگوں کو کافر' ظالم اور فاسق کہا ہے۔

دوسرے امور تدبیری ہیں۔ان کا حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔مثلاً جنگ کے حالات وغیرہ۔ان امور میں حکومت مشورہ کرتی ہے اور اجتماعی مفاد میں فیصلے کرتی ہے۔طے شدہ امور میں مشورہ اور اجتہاد وغیرہ نہیں ہے۔اجتہاد تدبیری امور میں ہے۔اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ پیش آمدہ جدید مسائل میں بھی مخصوص شریعت سے حکم معلوم کیا جائے۔یہ علماء شریعت کا کام ہے۔بعض ملحدین نے اجتہاد سے مراد یہ لیا ہے کہ جہاں قرآن وحدیث خاموش ہوں' وہاں مصالح عامہ میں اپنی دانش اور حالات کے تقاضے کے تحت فیصلے کئے جائیں۔اس سے جدیدیت کے حامیوں نے الحاد کا دروازہ کھولا ہے۔بظاہر یہ لوگ کہتے یہ ہیں کہ ہم اجتہاد کا دروازہ کھول رہے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن وحدیث کو خود خاموش کر کے اجتہاد کا دروازہ بند کرتے ہیں اور الحاد کا دروازہ کھولتے ہیں۔عموماً حکومتوں نے مالی' سیاسی اور جہاد وغیرہ کے امور میں بالخصوص یہی کچھ کیا ہے۔آہستہ آہستہ انہوں نے اللہ کی شریعت کو ہی بدل دیا۔حتیٰ کہ حلال وحرام کا مسئلہ جو کہ شریعت میں طے شدہ ہے' اس پر بھی اپنے اجتہاد فٹ کئے۔عموماً ایسی قانون سازیاں پارلیمنٹوں میں ہوتی رہیں۔پاکستان میں عائلی اور مالیاتی قوانین اس کی بڑی بڑی مثالیں ہیں۔سود اور حرام کاروبار کو تحفظ دینے والی پارلیمنٹ ہی رہی ہے۔جدید دور میں اس کو خدا کا درجہ دے دیا گیا ہے جس کا اختیار سب پر ہوتا ہے اور اس پر کسی کا اختیار نہیں چلتا۔پہلے زمانوں میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک بنایا جاتا۔مشرکین مکہ شریکوں کو اللہ سے چھوٹا سمجھتے۔لیکن جدید دور میں اللہ کا حکم بھی معاذ اللہ پارلیمنٹوں پر نہیں چلتا۔اللہ کے حکم کے سامنے حکام بولتے رہتے ہیں۔لیکن پارلیمنٹ کے سامنے خاموش ہو کر آداب بجالاتے ہیں۔ایسا بڑا شرک تو پہلے مشرکین میں بھی نہیں پایا جاتا تھا۔اس کے باوجود ہمارے ہاں اس جدید شرک کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔جن کے پاس اسلام کی روشنی تھی ہی نہیں' وہ اتنے بڑے شرک کے مرتکب نہیں ہوتے تھے۔افسوس اس بات پر بھی ہے کہ آج الحاد کا سارا دھندہ اسلام کی روشنی کے نام پر ہو رہا ہے اور بعض علم دان بھی اس عمل میں شریک ہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ آج ہم توحید حاکمیت پر بھی اتنا ہی زور دیں جتنا کہ توحید کی باقی قسموں پر دیتے ہیں۔

مندرجہ بحث میں واضح کیا گیا ہے کہ حکومتوں کو کن امور میں فیصلے کرنے چاہئیں اور کن امور میں وہ صرف اطاعت اور حکم کو قائم کرنے کے پابند ہیں۔مزید وضاحت اس بات سے بھی ہو جاتی ہے کہ قانون کی عموماً دو بڑی قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔پہلی قسم بنیادی قوانین کی ہے جن میں بندوں کے حقوق کا تعین اور ان کا دائرہ کار آتا ہے' انہیں خود نہیں بنایا جاسکتا۔یہ اللہ کی طرف سے پہلے سے طے شدہ ہیں۔دوسری قسم میں تحتی قوانین یا جنہیں بائی لاز یا رولز اینڈ ریگولیشنز کہا جاتا ہے' وہ آتے ہیں۔یہ تدبیری امور و قوانین ہیں جو اپنی سہولت کے مطابق شریعت کے دائرے میں رہ کر بنائے جاسکتے ہیں۔ان دونوں کو ہم اس طرح سمجھ سکتے ہیں۔مثلاً کاروبار میں شریعت نے حلال وحرام کی پابندی لگا دی ہے۔بعض کاروبار اور نفع کمانے کے طریقے حرام قرار دے دیئے گئے ہیں۔ان کو حکومت تبدیل نہیں کرسکتی۔اللہ کے حرام کو حلال یا اللہ کے حلال کو حرام نہیں کرسکتی۔لیکن جو کاروبار حلال ہیں' ان کے لئے شراکت کھاتے وغیرہ کے لئے کمپنی لاز بنائے جاسکتے ہیں۔اللہ کے بنائے ہوئے دائرے کے اندر رہ کر اصول وضوابط طے کئے جاسکتے ہیں جو قانون کی اصطلاح میں ایکٹ کہلاتے ہیں۔تاکہ کسی پر ظلم نہ ہو۔حکومت ایسے قوانین بنا سکتی ہے اور نگرانی بھی حکومت کا کام ہے۔لیکن کوئی قانون اللہ کے حکم کے خلاف نہ ہو۔یہ دراصل اللہ کے حکم کو قائم کرنے کا طریقہ ہی ہوگا۔جہاں اللہ کی نافرمانی ہوگی' وہیں حکومت حرکت میں آئے گی اور سب کو اللہ کی اطاعت پر لائے گی۔یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داریاں ہیں جن سے موجودہ مسلم ملکوں کی حکومتیں عہدہ برآ نہیں ہوئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم ملکوں کے حکمرانوں اور پارلیمنٹوں کے رویئے' ان کے مفادات اور مصلحتیں اللہ کی حاکمیت کے قیام کی راہ میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ضرورت اس بات کی ہے کہ حکمرانوں اور اہل سیاست کو دعوت دی جائے۔انہیں اللہ کا حق سمجھایا جائے۔ان میں سے اکثر لوگ وہ ہیں جو اسلام کے بنیادی عقائد سے واقف نہیں ہیں۔ان پر کفر کے فتوے کارگر نہیں ہوں گے۔بلکہ دعوت کی حکمتوں کو پیش نظر رکھ کر بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔مسلم

حکمرانوں میں سے کچھ لوگ اگر دین سے واقف ہیں تو ان پر خواہشات کا غلبہ ہے اور مفادات اور اکثر کو مشکلات نے گھیر رکھا ہے۔اس کے لئے علماء کو بھرپور کردار ادا کر کے نہایت اہم فریضہ ادا کرنا چاہئے اور خود کو مفادات سے بالا رکھ کر اسلام کی صحیح دعوت پیش کرنی چاہئے۔

امور حکومت اور غلطی کے شکار علماء کے تین طبقے

عالم اسلام میں عموماً تین قسم کے علماء نے امور حکومت کی طرف توجہ دی ہے......علماء کا ایک طبقہ وہ ہے جو اپنے مفادات کے حصول کے لئے ہر حکومت کے ساتھ ہے۔ان کی باطل تاویلوں نے حکومتوں کو باطل پر قائم رکھنے کا سہارا دیا ہے۔ویسے تو ہر دور میں ایسے لوگ رہے ہیں جو ہر طرح کے فتوے حکومتوں کو دیتے رہے ہیں۔وہ حکومتوں کا رجحان دیکھتے ہیں۔آج بھی ایسے علماء کی کمی نہیں ہے۔ضیاء الحق کے دور حکومت میں جمہوریت کو مغربی کہہ کر اس کے خلاف فتوے دیتے تھے۔تو آج وہی جمہوریت کے حق میں دلائل دیتے ہیں۔ان سے طالبان یا امریکہ کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف فتویٰ لیا جا سکتا ہے۔ان لوگوں کو اللہ سے ڈرنا چاہئے اور حکومتوں کو غلط مشورے نہیں دینا چاہئے اور معمولی دنیاوی لالچ میں دین کا نقصان نہیں کرنا چاہئے......دوسرا طبقہ علماء کا وہ ہے جو غلط فہمی کا شکار ہیں یا مجبوری کا سہارا لیتے ہیں لیکن ویسے اپنے تئیں دین کے ساتھ مخلص ہیں۔ان کے ذاتی مفادات نہیں ہیں بلکہ وہ دین کے لئے بہت محنت کرتے ہیں۔ان کے پاس اصلاح کے بڑے بڑے پروگرام بھی ہیں۔مصر، شام، پاکستان اور دوسرے مسلم ملکوں میں علماء کی ایسی تعداد ہے جنہوں نے اصلاح امت کا فریضہ ادا کرنے کے لئے جمہوریت کی عملی سیاست میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔وہ طے شدہ نظاموں کے تحت انتخابات میں حصہ لیتے رہے اور کبھی پارلیمنٹ میں کوئی سیٹ بھی لے لیتے۔یہ بزرگ اصلاح کے بڑے بڑے پروگرام اپنے پاس رکھتے تھے۔لیکن انہیں ظالم سماج نے موقع ہی نہیں دیا۔بہت سارے دل ہی دل میں پروگرام رکھ کر دنیا سے رحلت فرما گئے اور کچھ باقی ہیں جن کی بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ان کی مشکل یہ رہی ہے کہ وہ نظام کو غلط نہیں کہہ سکے کیونکہ وہ نظام کا حصہ رہے۔اگر کبھی غلط کہا بھی تو ان کو صرف اس بات پر چپ کروا دیا گیا کہ چونکہ عوام نے آپ کو سیٹ سے محروم کر دیا ہے، اس لئے شکست خوردہ ہو کر آپ باتیں کر رہے ہیں۔حکومتی اور جمہوری ایوانوں میں علماء و مصلحین کے اس طبقے کے ہونے یا نہ ہونے سے سرکاری اداروں، پارلیمنٹوں اور جمہوریتوں میں اصلاح کے حوالے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔البتہ یہ بزرگ ملکوں کی سیاست میں پہچانے جاتے رہے اور ان کے بیانات اور تحریروں سے اسلام پسند طبقے کے محروم لوگوں کو حوصلہ ملتا رہا۔وہ پارلیمنٹوں سے باہر اسلام کا کام کرتے رہے اور اس سے کچھ فائدہ بھی محسوس کیا گیا......تیسرا طبقہ ان لوگوں کا

ہے جنہوں نے پارلیمانی جمہوری سیاست میں حصہ لینے کی بجائے دعوت کا راستہ اختیار کیا۔لیکن ان کی دعوت میں تکفیر کا عنصر بہت غالب تھا۔انہوں نے حکمرانوں پر خاص طور پر کفر کے فتوے لگانے پر زور رکھا۔دعوت کی حکمتوں کی بجائے شدتوں کا راستہ اختیار کیا۔شدتیں جب جماعتوں میں آ جائیں تو نقصان بہت ہوتا ہے۔تکفیر میں شدت کی وجہ ہی تھی کہ مصر، شام، الجزائر اور دوسرے بہت سے ملکوں میں حکومتوں سے یہ لوگ ٹکرا گئے۔ملکوں اور حکومتوں کا کم لیکن ان جماعتوں کا نقصان بہت زیادہ ہوا۔سب سے زیادہ نقصان اسلام کی دعوت کا ہوا۔علماء کے خلاف دنیادار طبقے کو پراپیگنڈے کا بہت موقع ملا۔مغرب اور مغرب زدہ لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو اسلام سے متنفر کیا۔سب سے زیادہ جہاد تختۂ مشق بنا۔اسی بنیاد پر جہاد کے مخالفین نے جہاد کو غلط معنوں میں پیش کیا۔اسے دہشت گردی قرار دیا گیا۔مسلمانوں کے بارے میں یہ ذہن بنایا گیا کہ یہ لوگ اپنوں اور غیروں کے خلاف لڑنے والے ہیں۔اس سے ظالموں کو کھلی چھٹی مل گئی۔یہ جہاد بند کرنے کی بڑی سازش ہے۔اس سے اسلام کے عمل اور ترقی کو روکنا مقصود ہے۔لیکن مسلمانوں کے اندر بھی قصوروار موجود ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کی دعوت کو اس کی ہمہ گیریت کی خصوصیت کے ساتھ پیش کیا جائے۔کفر کے فتوؤں کی بجائے دعوت کو دلائل سے مزین کیا جائے۔ہر طبقے کو مخاطب کیا جائے اور مفادات سے بالا ہو کر خالص اللہ کی رضا کے لئے محنت کی جائے۔دنیا کے ہر حساس مسئلے کو اسلام کی دعوت کا موضوع بنایا جائے اور امت مسلمہ کی زبوں حالی، اس کی بے بسی اور کم مائیگی کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے اور خاص طور پر اسلامی جہاد کو صحیح شکل میں پیش کیا جائے۔دعوت اور جہاد دونوں میدانوں میں منہجی اور عملی کام کی ضرورت ہے تاکہ مسلمانوں کے ذہن واضح کئے جائیں اور مسلمانوں کے آپس میں ٹکراؤ ختم کیے جائیں۔اس سے اسلام کی دعوت آگے بڑھے گی اور حکم اللہ کے قیام کے راستے استوار ہوں گے۔ان شاء اللہ

ہماری عافیت اللہ کے حکم اور دین کو قائم کرنے میں ہی ہے

ایک نظر اس پر بھی کہ آج دنیا میں ہو کیا رہا ہے۔ یہ دلخراش صورت حال ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے باغیوں نے مسلمانوں کو باطل نظاموں کا باغی قرار دے کر ان سے حقوق چھین لئے ہیں۔ علاقوں پر قبضے کر لئے ہیں اور اللہ کے سچے داعی مسلمانوں کے لئے عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔ اس ظلم کو برداشت کر کے بیٹھے رہنا اور دعوت کے ساتھ جہاد کی تیاری نہ کرنا امت مسلمہ کا بہت بڑا جرم ہے۔ ہر مسلمان فرد، جماعت اور حکومت کو اپنے وسائل اور اثرات کی بنیاد پر اللہ کے دین کے اس مسئلے پر بھرپور اور فی الفور توجہ کرنی چاہئے ورنہ غلامیاں اور محرومیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ مسلمان اپنے ملک اور حقوق محفوظ نہیں رکھ سکیں گے اور ہم اللہ کے سامنے کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

مسلمانوں کو پہلے اپنے دفاع کی جنگ لڑنی ہے اور جہاں مسلمانوں کو اللہ قوّت عطا فرما دے، وہاں اللہ کا حکم قائم کرنا ہے اور اللہ کے حق کے لئے اللہ کے باغیوں اور طاغوتوں سے لڑنا ہے۔ تا آنکہ روئے زمین پر اللہ کا حکم قائم ہو جائے اور طاغوتوں کے سب حکم اور سب کلمے مغلوب ہو جائیں۔

اللہ کے دین کے لئے قربانیاں اکارت نہیں جاتیں؛ دین محض حکومت کے حصول کا نام نہیں

افغانستان کے حالات و واقعات سے قطعاً غلط مطلب نہیں لینا چاہئے۔ یہ سوچ غلط ہے کہ وہاں مسلمان اگر جہاد نہ کرتے تو ان پر ظلم نہ ہوتا لہٰذا کشمیر و فلسطین یا کہیں اور بھی جہاد کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ آج کفر زوروں پر ہے۔ کہا جاتا ہے بس وقت کا انتظار کیجئے اور اپنی نماز روزہ ادا کرتے رہئے یا زیادہ سے زیادہ تبلیغ کے کچھ کلمے پڑھا کر اپنا فرض پورا کیجئے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ افغان اگر جہاد نہ کرتے اور روسی غلامی کو قبول کرتے تو ان کا حال وہی ہوتا جو روسی ریاستوں میں مسلمانوں کا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے جہاد کیا، اللہ نے انہیں بڑی غلامی سے بچالیا۔ امریکہ کے ظلم کے بعد آج افغانستان میں عبوری حکومت والے اگر حکومت میں آئے ہیں تو وہ بھی افغانستان میں شرعی قوانین کے نفاذ کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ مجاہدین کی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ انہی قربانیوں سے کمیونزم کی یلغار رکی۔ اسی سے صلیبی یلغار بھی رکے گی۔ ان شاء اللہ

افغان معاشرے میں آج بھی اسلام کے گہرے سائے ہیں۔ مجاہدین صرف حکومتوں کے حصول اور کرسیوں کے لئے قربانیاں نہیں دیتے۔ وہ اسلام کو قائم کرنے کے لئے قربانیاں دیتے ہیں۔ قربانیوں کا بہرحال فائدہ ہوتا ہے۔ دین قائم کرنے سے مراد صرف حکومت قائم کرنا نہیں ہوتا۔ حکومت بھی ایک ذریعہ ہے لیکن مسلمان اسلام کے عمل پر قائم ہوں اور دعوت و جہاد کے لئے قربانیاں دینے والے نکلتے رہیں تو اس سے بھی دین قائم رہتا ہے۔ حکومت کے تصور نے اور محض اس کے لئے تمام توانائیاں صرف کرنے کے کام نے اسلامی جماعتوں کو جمود کا شکار کر دیا ہے۔ مایوسیوں سے نکلنے اور جمود توڑنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ دعوت و جہاد کو صحیح منہج میں چلایا جائے۔ مسلمانوں کو مادیت کے خلاف بڑی جنگ لڑنے کی تیاریاں کرنی ہیں۔ سوچئے یہ تیاریاں کہاں ہو رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کفر و طاغوت نے ان کو ہی نشانہ بنایا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ کا پراپیگنڈہ اپنی جگہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ افغانستان میں دین کا گہرا رنگ باقی ہے۔ امریکی اور اتحادی فوجیں اس رنگ کو نہیں اتار سکیں گی اور طاقت اور لالچ کے زور پر آنے والے لوگ افغانستان کو کفر کا غلام نہیں بنا سکیں گے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں جاری رہنے والے جہاد نے وہاں اسلامی دعوت و عمل کو گہرا کر دیا ہے۔ اور یاد رکھئے اللہ کے لئے کیا ہوا عمل اور اللہ کے لئے دی ہوئی قربانی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ اس کے اثرات دنیا ضرور دیکھے گی اور اللہ کے لئے بہا ہوا خون رنگ دکھائے گا۔ کفر و طاغوت کے خلاف لڑتے ہوئے مسلمان شہید ہو جاتے ہیں۔ گرفتار ہو جاتے ہیں اور زخموں سے چور ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات افغانیوں کی طرح پوری قوم ہی زخمی ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسی قوموں پر غلامی کا داغ نہیں لگتا۔ وہ ناکام نہیں ہوتے۔ ناکام وہ مسلمان ہوتے ہیں جو کفر کی غلامی قبول کر کے طاغوت کے سامنے سرنڈر ہو جائیں۔ ان کا سب اثاثہ ضائع چلا جاتا ہے اور دوبارہ سے ان کا اٹھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ آفرین ہے افغان مجاہدین پر کہ انہوں نے دنیا کے فرعونوں کے سامنے جھکنا قبول نہیں کیا۔ ان کی نسلیں اٹھیں گی اور کفر سے لڑیں گی۔ اللہ توفیق سے نوازے گا۔ تاریخ میں کئی بار ایسا ہوا ہے۔ ہمیشہ مسلمانوں کی اپنی غلطی سے باغ اجڑے ہیں۔ غداریاں ہوئی ہیں۔ بہت نقصان اٹھانے پڑے ہیں۔ لیکن اللہ کے لئے کیا ہوا عمل باقی رہتا ہے۔ مسلمانوں کو بس یہ سمجھ کر کفار کے خلاف جہاد جاری رکھنا چاہئے کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ جو لوگ مادی نتائج کو معیار قرار دے کر حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ کبھی حقائق تک نہیں پہنچ سکتے۔ مادیت ان کو دھوکہ دیتی ہے اور وہ دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ مادیت کے پرستاروں کے دھوکے میں نہ آئیں۔ اسلام پر استقامت اختیار کریں اور اللہ کے حکم کے قیام کی کوشش کریں۔ حاکمیت کے بیان میں حالات کی بحث اس لئے ضروری ہو گئی تھی کہ آج سخت مقابلہ اس بنیاد پر کیا جا رہا ہے کہ جہاں بھی الحکم للہ کے لئے کوشش ہوئی

‘وہاں طاغوت پوری قوت استعمال کر کے اس کوشش کو روکتے رہے ۔ترکی میں ایسا ہی ہوا ہے۔ پھر عالم اسلام میں ہر جگہ یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ الجزائر اور افغانستان میں قوت استعمال کی گئی اور کشمیر و فلسطین میں بھی جو جہاد جاری ہے‘ اس کے لئے یہی پروگرام ہیں۔ مسلمان گھبرائیں نہیں بلکہ اللہ کی خاطر قربانیاں پیش کر کے اپنا فرض ادا کریں اور اپنی نجات کا اہتمام کریں۔ کفار کے حربوں کو خوب سمجھیں۔ ان کے معاہدات‘ مذاکرات اور بین الاقوامی رابطے اور ڈھانچے ادارے سب اسلام کو روکنے کے لئے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اور غلامی کا پورا پیکج قوموں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومتیں ان کے پیکج مانتی اوران کے کام آتی ہیں۔ یہ وقت مشکل ضرور ہے‘ رکاوٹیں بہت زیادہ ہیں لیکن اسلام کی نمائندگی کرتے ہوئے چلنا ہی مسئلے کا حل ہے۔ مایوس ہوجانا‘ رک جانا اور ہمت ہار جانا ہلاکت ہے۔ اللہ اپنے بندوں کے لئے راستہ کھولتا ہے۔ آزمائش ضرور کرتا ہے لیکن استقامت اختیار کرنے والوں کی مدد کرتا ہے اور مشکلات آسان ہوجاتی ہیں۔ اللہ کی رحمت اور نصرت کی امید رکھئے اور جو کچھ پاس ہے‘ اللہ کے لئے پیش کردیجئے۔ ہاتھ خالی ہوجائیں تو وہی اللہ کے سامنے اٹھا دیجئے۔ یہی انبیاء‘ صدیقین اور صالحین کا شیوہ رہا ہے۔ کبھی اپنی مجبوریاں بندوں کے سامنے نہ رکھئے۔ اپنے دکھ درد اللہ کے سامنے پیش کیجئے اور دنیا والوں کے سامنے کسی کمزوری کا اظہار نہ کریں۔ انمااشکوبثی و حزنی الی اللہ

توحیداسماءوصفات کے بارے چندسوالات وجوابات

آدم اوراللہ کی شکل

س۔ ایک طرف ہم کہتے ہیں کہ اللہ کی صفت کی کوئی تاویل یا تشبیہ وغیرہ نہ بیان کریں جبکہ ایک حدیث میں اللہ خود اپنی تشبیہ بیان کرتا ہے کہ اس نے آدم کو اپنی شکل پر پیدا کیا؟

ج۔ حدیث میں یہ الفاظ آتے ہیں۔

خلق الله آدم علی صورته (غالباً مسلم بحوالہ نووی)

اس کا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ نے آدم کو اس کی یعنی آدم کی صورت پر پیدا کیا ہے تو تب اس میں ابہام والی بات ہی نہیں رہی۔اس کی صحیح تشریح تو یہی ہے کہ اللہ نے جو کہا ہے' اس کا صحیح مطلب وہ خود ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمیں تو اتنا بتایا گیا ہے کہ اللہ کی کوئی تشبیہ ہم نے خود بیان نہیں کرنی...... یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہم اپنی طرف سے کوئی قیاس' تشریح یا حکم نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ ہمیں اس سے منع کیا گیا ہے۔اس میں حقیقت کیا ہے' یہاں پر یہی کہہ دینا ہی بہتر ہے کہ اسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ہم نہیں جانتے۔ یہاں آکر ہمارا علم ختم ہے۔وہ خود جو بھی بیان کردے' ہم اتنا ہی اس پر ایمان لاتے ہیں۔ویسے تو یہ قرآن سے ثابت ہے کہ اللہ کا ہاتھ بھی ہے اور اس کی پنڈلی بھی ہے اور اس کا چہرہ بھی ہے۔ان کی شکل اور کیفیت و ہیئت کا اندازہ لگانے کا پھر بھی ہمیں حکم نہیں ہے......اگر ہم اپنی طرف سے ان کی کوئی شکل متعین کرتے ہیں تو اسے شیطان کا دھوکا سمجھا جائے۔انسانی شکل پر تو انہیں ہم قیاس کر ہی نہیں سکتے۔حدیث میں تو یہ بھی آتا ہے کہ اللہ کے دونوں دائیں ہاتھ ہیں۔(حوالہ؟) انسان کے تو دائیں بائیں ہاتھ ہوتے ہیں۔اب ہم کیسے یہ تصوّر کرسکتے ہیں کہ اللہ کے دونوں ہاتھ دائیں کیسے ہوں گے۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔اس کی پنڈلی بھی ہے اور اس کا چہرہ بھی ہے لیکن کس طرح کا ہے' اس کیفیت کا اندازہ ہم کبھی لگا ہی نہیں سکتے۔

اللہ کو حاضر ناظر مان کر گواہی دینا

س۔ اللہ کو حاضر ناظر مان کر گواہی دینا یا اس کو گواہ بنا کر قسم کھانا کیسا ہے۔

ج۔ اللہ کو حاضر ناظر ماننے کا عام طور پر ایک خاص طبقہ یہی مطلب لیتا ہے کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔اگر اس نظریہ سے یہ کہا جائے تو غلط ہے کیونکہ اس کے پیچھے وحدت الوجود کا گمراہ کن عقیدہ کارفرما ہوتا ہے جس کی رو سے وہ ایسی باتیں کر کے بالآخر ہر چیز کو خدا قرار دے دیتے ہیں۔لیکن اگر کوئی اللہ کو اس طرح گواہ بنا کر قسم کھاتا ہے کہ اس کے خیال میں اللہ دیکھ رہا ہے اور قیامت کے دن اللہ کے سامنے یہ بات کھل جائے گی تو اس طرح یہ جائز ہے کیونکہ اللہ بہر حال شاہد بھی ہے' وہ دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے۔اگر عقیدہ یہ نہیں تو پھر ہم کون ہیں اللہ کو گواہ بنانے والے۔اللہ کی مرضی ہے کہ وہ کسی کا گواہ بنے نہ بنے۔ہم اس کو اپنی مرضی کا پابند کیسے کرسکتے ہیں؟

س۔ ایک حدیث میں اللہ کا دیدار قیامت سے پہلے شہادت کے بعد ایک صحابی ابو جابر عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو ہوا جبکہ دیگر احادیث میں یہ دیدار قیامت کے بعد جنتیوں کو ہوگا۔اصل مسئلہ کیا ہے؟ (حافظ صاحب ضروری سمجھیں تو اس کا جواب دے دیں)

''کن'' اور ''چھ دن'' کا مسئلہ

س۔ اللہ نے ایک جگہ تو کہا کہ وہ ہر کام ''کن'' کہہ کر کرلیتا ہے لیکن دوسری جگہ کائنات کو چھ دن میں پیدا کرنے کی بات کی۔ان میں کیا فرق ہے؟

ج۔ ان میں فرق کوئی نہیں۔اللہ چاہتا تو کن فیکون کہہ کر بھی یہ کام کرسکتا تھا۔لیکن یہ بھی اس کی مرضی تھی کہ اس نے چھ دن میں زمین وآسمان کو پیدا کیا۔ اللہ ہر صورت میں اپنی مرضی کا اظہار کررہا ہے کہ وہ جیسے چاہے کرسکتا ہے۔ہم ان دونوں باتوں کو مانتے ہیں کیونکہ دونوں ہی اللہ کی بتائی ہوئی ہیں۔(ویسے حم

السجدۃ۔9 میں آٹھ دنوں میں زمین وآسمان اور زمین کے رہنے والوں کی غذا کی تیاری کا بھی ذکر ہے۔واللہ اعلم)

اللہ کی صفت الظاہر اور بندے کی شکل میں ربّ کا ظاہر ہونا

س۔ اللہ نے خود کو الظاہر بھی کہا ہے اور الباطن بھی۔کیا ظاہر سے مراد یہ نہیں کہ وہ ہر جگہ نظر آتا ہے اور ہر جگہ موجود ہے؟

ج۔ قرآن میں اللہ نے کہا ہے کہ وہ دنیا میں نظر نہیں آتا۔لاتدرک الابصار اب الظاہر سے خود ہی یہ مراد لینا کہ اللہ ہر جگہ نظر آتا ہے تو یہ ہمارا اپنا معنی ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ظاہر ہونے کی کیفیت کیا ہے' باطن کی کیفیت کیا ہے' اس کا ہم ادراک نہیں کر سکتے۔وہ ہم جیسا تو نہیں ہے کہ ایک آدمی کپڑا لے کر چھپ جائے تو وہ چھپ گیا اور کپڑا ہٹا لے تو وہ ظاہر ہو گیا۔اللہ تعالیٰ نے کہا' میں ظاہر ہوں' ہم مانتے ہیں' اس نے کہا' میں باطن ہوں' ہم مانتے ہیں لیکن کیسے ظاہر ہے اور کیسے باطن ہے' ہمیں اس کے بارے کچھ نہیں بتایا۔اس لئے ہم بھی نہیں جانتے اور نہ کچھ بیان کرنے کے مجاز ہیں۔یہ ظاہر اور باطن کے اپنے معنی کرنے والے دراصل ہندوؤں کے عقیدے کے ثابت کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں اللہ مختلف چیزوں میں ظاہر ہوتا ہے۔مختلف شکلوں میں آتا ہے۔وہ انسانوں میں حلول کر جاتا ہے۔ظاہر میں وہ انسان ہوتا ہے' باطن میں وہ اللہ ہی ہوتا ہے۔یہی باتیں انہوں نے پیغمبروں اور کئی ولیوں پر بھی فٹ کر دیں۔اسی گمراہ کن عقیدے کے نتیجے میں یہ مشہور شعر کہا گیا

وہ جو مستوی تھا عرش پہ خدا ہو کر

اتر پڑا مدینے میں مصطفیٰ ہو کر (نعوذ باللہ)

اس لئے اگر ہم اللہ کی صفات کے معاملے میں صرف اسی پہ اکتفا کریں جو ہمیں اللہ یا اللہ کے رسول ﷺ نے بتا دیا ہے تو ہم گمراہی سے بچے رہیں گے ورنہ اپنے معنی کرنے سے ایمان کا نقصان ہی ہوگا۔

توحید کا فائدہ

توحید کے تین فائدے ہیں۔

1- آخرت میں انسان اللہ کے عذاب سے امن میں ہو جائے گا۔جہنم سے چھٹکارا مل جائے گا۔اس لئے کہ یہ اللہ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَادُوْنَ ذَلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ

بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہے گناہ بخش دے گا لیکن شرک کو نہیں بخشے گا۔(النساء-48)

2- دنیا میں ہدایت کا باعث ہے اس لئے کہ ہدایت ملتی ہی اسے ہے جس کا ایمان توحید پر ہو۔مشرک کو جب تک شرک نہ چھوڑے' باقی ہدایت بھی نہیں مل سکتی۔

3- توحید کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ گناہوں کے کفارے کا باعث بن جاتی ہے۔اس کی وجہ سے انسان کے باقی گناہ اللہ بخش سکتا ہے اور یہ ان کے کفارے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

توحید کے ان فوائد کا ذکر کرتے ہوئے اللہ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَلَمْ يَلْبَسُوا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُهْتَدُوْنَ

حقیقت میں تو امن انہی کے لئے ہے اور وہ راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔

یہاں ظلم سے مراد شرک ہے اس لئے کہ اللہ نے قرآن میں فرمایا۔اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔(لقمان۔13)

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔

حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ اَنْ لَّا يُعَذِّبُ مَنْ لَّا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا

بندوں کا حق اللہ تعالیٰ کے ذمہ یہ ہے کہ وہ اس آدمی کو عذاب نہ دے جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ (متفق علیہ)

اس سے پہلے ہم اسی حدیث کا پہلا حصہ پڑھ چکے ہیں جس میں یہ ذکر ہے کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے۔

حَقُّ اللَّهِ عَلَى الْعِبَادَ اَنْ يَّعْبُدُوهُ وَلَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئاً

اللہ کا حق بندوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں (متفق علیہ)

اسی سلسلے میں اب آگے بتایا گیا کہ جب بندے اللہ کا یہ حق ادا کر دیتے ہیں کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے تو پھر اس کا فائدہ اور صلہ اللہ انہیں آخرت میں دیتا ہے۔ اللہ اپنے اوپر بندوں کا یہ حق بنالیتا ہے کہ انہیں توحید پر ایمان لانے کے عوض ان کے باقی گناہ بخش دے اور انہیں جہنم کے عذاب سے بچالے۔